راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کے 26 کامیاب سال

ماہنامہ

ارژنگ

لاہور

Monthly
Arzang
Lahore

مدیر اعلیٰ:
عامر بن علی

مدیران:
حسن عباسی
لبنیٰ صفدر

جولائی ۲۰۲۶ء

CamScanner

تخلیقی ادب کسی بھی زبان میں زندہ رہنے والا ادب ہوتا ہے

آج کل مشاعرے ورائٹی شو بن گئے ہیں

معروف شاعر

ادیب، دانش ور

افضل مراد

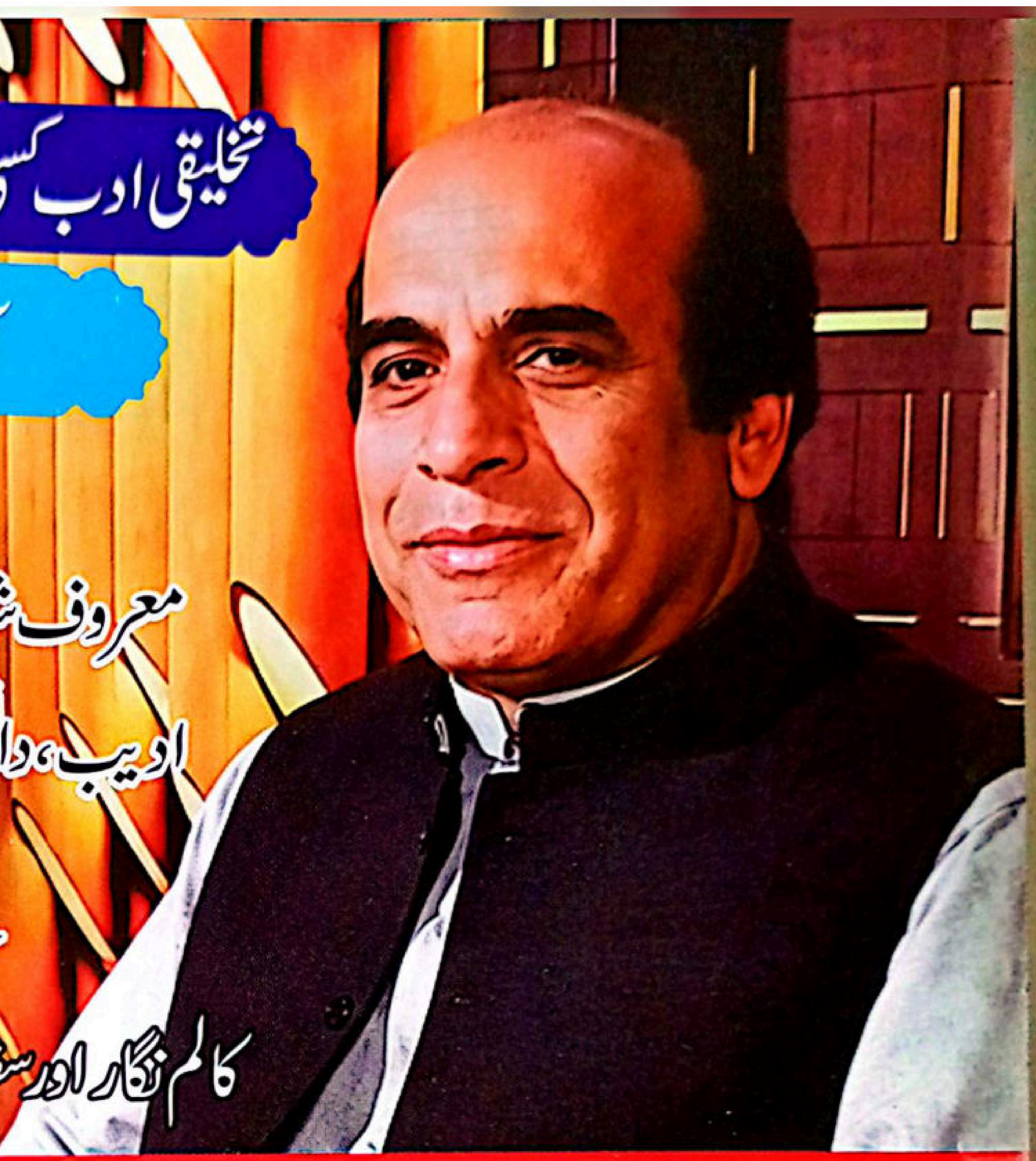

سے مدیرِ اعلیٰ ارژنگ، معروف شاعر،

کالم نگار اور سفرنامہ نگار عامر بن علی کی خصوصی گفتگو

کتاب لکھنے والے کے لیے اولاد کی طرح ہوتی ہے، اس میں فرق رکھنا ناممکن ہے

افضل مراد مقبول شاعر اور تمام اصناف سخن میں انتھک کام کرنے والے ادیب دانشور ہیں مگر میری ان سے ذاتی عقیدت مندی کی خاص وجہ ان کی جاپان سے اردو زبان میں آئی صنف سخن ''ہائیکو'' کی شاعری ہے۔ اب تک ان کے دو ہائیکو مجموعے ''ترنگ'' اور ''ویراں خیمے کا سایہ'' کے نام سے شائع ہو کر سند قبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ شاعری اور نثر ایسی خوبصورت لکھتے ہیں کہ کسی ایک صنف کا انتخاب کرنا پڑے تو آدمی مشکل میں پڑ جائے کہ کون سا کام زیادہ خوبصورت ہے؟ اردو اور براہوی دونوں میں یکساں تخلیقی کام کیا ہے۔

برس ہا برس اکادمی ادبیات بلوچستان کے مدارالمہام رہے۔ آج کل اگرچہ ریٹائرڈ ہیں مگر لکھنے، پڑھنے کا کام پہلے سے بھی زیادہ اور بھرپور کر رہے ہیں۔ بقول شخصے ریٹائرڈ ہو کر زیادہ جوان ہو گئے ہیں۔ اسلام آباد میں ایک ادبی کانفرنس سے کوئٹہ واپسی پر میاں چنوں میرے گھر تشریف لائے تو خواہش تھی کہ ان کا انٹرویو کیا جائے مگر تب یہ نہ ہو سکا۔ برسوں بعد یہ خواہش اب پوری ہوئی ہے۔ قارئین ارژنگ کی خدمت میں افضل مراد سے ہونے والی گفتگو پیش کرتا ہوں۔

ارژنگ: بچپن کہاں گزرا؟ گردوپیش کے حالات کیسے تھے؟

افضل مراد: بچپن سبھی کا معصومیت، سادگی لاپرواہی اور خوب صورت یادوں اور خوابوں کا زمانہ ہوتا ہے، ہمارا بچپن بھی کچھ کچھ ایسا تھا مگر ہمیں سوال کرنے اور سوچتے رہنے کی عادت نے قدرے مختلف بنا دیا تھا، چیزیں لوگ، اردگرد کی فضا، یہ رشتے، یہ راستے، خوشی غمی کی کیفیتیں، یہ سب کیا ہیں، یہ زمین کتنا بوجھ برداشت کر سکتی ہے، آسمان

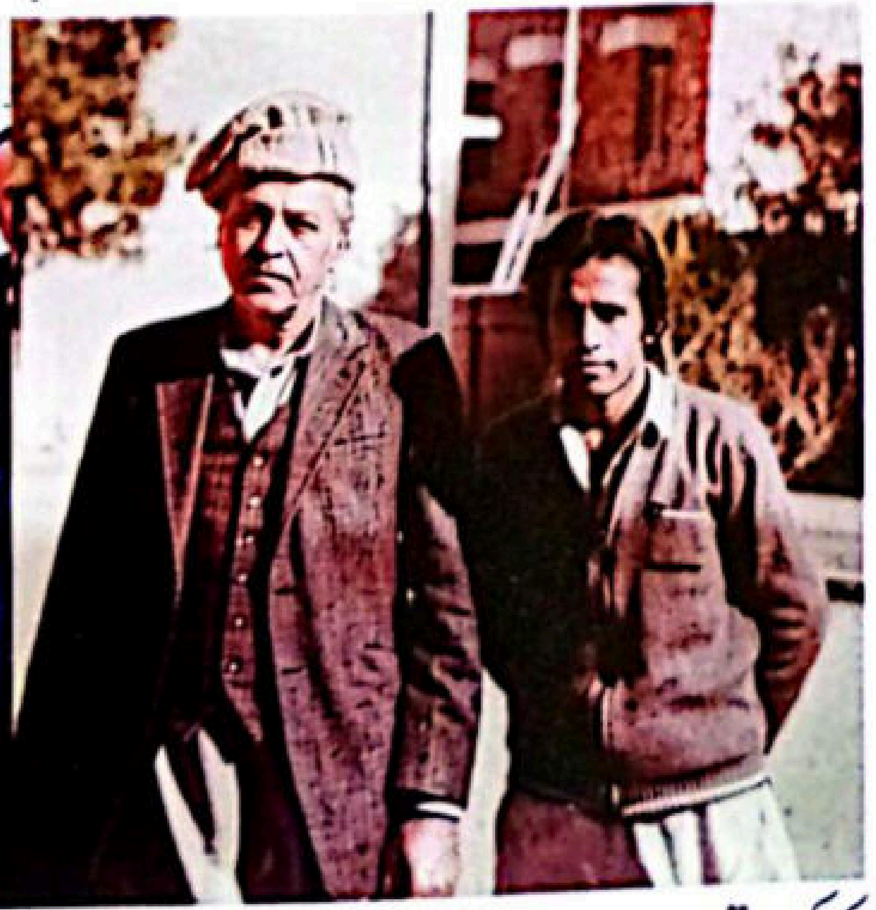

کو کس قوت نے تھام رکھا ہے؟، یہ لوگ ایک دوسرے سے لڑتے کیوں ہیں؟، مرتے کیوں ہیں۔۔؟

چھوٹی سی عمر میں اتنا گم سم رہنا، اپنی عمر سے زیادہ کے سوالات کے بوجھ تلے۔ بچپن کی لاپرواہیاں متاثر ہوئیں۔ بڑوں سے ڈانٹ بھی پڑتی رہی مگر بدلنا ہمارے بس میں تھا، نہ اختیار میں، سو زندگی کی ابتدا یوں ہوئی۔

ابا روزگار کے سلسلے میں گاؤں سے شہر آئے ایک ورکشاپ میں انجن مکینک بنے بعد میں ایک دوا ساز کمپنی میں تاعمر ملازم رہے، کوئٹہ شہر کی ترقی کی رفتار بڑی حد تک سست روی کا شکار رہی۔ 1970 کی دہائی کے ابتدائی سال جب ہم پرائمری جماعتیں پاس کر چکے تب کوئٹہ کی سرسبز ہوائیں، خاموش فضائیں، تھوڑی سی آبادی محبت اخوت اور بھائی چارے کے انمٹ نقوش، کاریزیں، چشمے، برف اور بارش کی رومان پرور فضا اور برف کے مسلسل برسنے کے بعد کی ٹھنڈی ہوائیں اور کچے گھروں کی نرم گرم دنوں اور راتوں کی اپنی ایک خوب صورتی تھی۔ ہمارا بچپن فطرت کے ان رنگوں کے درمیان گزرا۔ جس میں سپنے تھے، چاروں طرف اپنے تھے، زندگی ایک خوب صورت ماحول کے ساتھ قدرت کی عطا لگتی تھی۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کے 26 کامیاب سال

MONTHLY Arzang LAHORE

ماہنامہ ارژنگ لاہور

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

جولائی 2026ء جلد 27 شمارہ 7

فہرست

حمد، نعت ، 2

سلام ، 3

مضامین:

- "سیرتِ معلم انسانیت" / سیرت نگار: ڈاکٹر طارق سلیم ، 5
- گھبرائے گی زینبؑ / منشی چھنولال دلگیر ، 7
- ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی: علم و تحقیق کا جہانِ دیگر / ڈاکٹر علی محمد خاں ، 8
- ڈاکٹر علی محمد خاں کی داستانِ حیرت کا قصہ / ڈاکٹر جمیل الرحمٰن ، 13
- ڈاکٹر فاروق عادل کی خاکہ نگاری پر ایک نظر / قمر زمان ، 16
- عامر بن علی: دھنک رنگ تخلیق کار / عدنان آصف بھٹہ ، 19
- مصنف اور قاری کے درمیان بولتا ہوا رشتہ / لبنیٰ صفدر ، 21

شعری گوشہ:

- راحت سرحدی ، سجاد بلوچ ، ایاز احمد ، ہمایوں راجا ، 23 تا 26

مضامین:

- محبت سے کون ڈرتا ہے / عامر بن علی ، 27
- نظم شخصی دائرہ: احمد ندیم رفیع / حسن عباسی ، 29

انٹرویو:

- بقیہ انٹرویو: افضل مراد ، 32
- بقیہ انٹرویو: شاہد علی خاں ، 35

افسانے:

- نامحرم / سیما پیروز ، 36
- باباجی / تسنیم کوثر ، 40

افسانچے: انجینئر ظفر محی الدین ، 44

- تبصرۂ کتب ، 46
- ادبی تقریبات ، 48

مدیرِ اعلیٰ

- عامر بن علی

مدیران

- حسن عباسی
- لبنیٰ صفدر

مجلسِ ادارت

- ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

مجلسِ مشاورت

- ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ: زرناب کمپوزنگ 0321-4730769

فوٹوگرافی: نعمان حسن 0333-4918383

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

0300-4489310

سالانہ ممبرشپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے نام اور شناختی کارڈ نمبر پر مبلغ -/2500 روپے بذریعہ موبائل کیش رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ فی شمارہ: 200

حسن محمود: 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر: 31204-7298386-9

Far East Marketing Co.

Samana Mansion 6.5 Koanp-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 108-0003 Japan
Email: femc1@hotmail.com

حمد

دن دکھاتا ہے، شب دکھاتا ہے
چار سو اپنی چھب دکھاتا ہے
دیکھ سکتے ہیں ہم فقط اُتنا
جس قدر ہم کو رب دکھاتا ہے
جانتا ہے ہماری تابِ نظر
پورا جلوہ وہ کب دکھاتا ہے
آنکھ کے اختیار میں نہیں کچھ
جب وہ چاہے ہے تب دکھاتا ہے
جتنے منظر ہیں سامنے، اُن میں
اپنی ہی تاب و تب دکھاتا ہے
جتنے بھٹکے ہوئے ہیں لوگ، اُن کے
قلب کو منقلب دکھاتا ہے
درِ توبہ پہ جب نہ آئے کوئی
اپنا غیض و غضب دکھاتا ہے
ڈھالتا ہے وہ ماہ و سال میں بھی
جو ہمیں روز و شب دکھاتا ہے
چاہتا ہے ہم اس پہ غور کریں
کچھ کہاں بے سبب دکھاتا ہے
ایک شامِ الم گزرنے پر
ایک صبحِ طرب دکھاتا ہے
سوچنے تو یقیں نہ آئے نسیم
معجزے وہ عجب دکھاتا ہے

نسیمِ سحر/راول پنڈی

اللہ نور خود ہے خالق بھی نور کا ہے
لاریب وہ ہی مالک یومِ نشور کا ہے
شمس و قمر ستارے امرِ خدا کے مظہر
ہر ایک شے میں جلوہ خالق کے نور کا ہے
حاضر وہی ہے ہر جا لیکن نظر سے پنہاں
انداز کیا نرالا اس کے ظہور کا ہے
ارض و سما میں ہر سو حُسن و بہا اسی سے
ہر اک جہان مظہر اس کے ہی نور کا ہے
مسجود وہ حقیقی، معبود وہ ہی تنہا
حاکم وہی حقیقی سارے امور کا ہے
سنتا ہے وہ ہی اختر مخلوق کی دُعائیں
سب پہ کرم جہاں میں ربِّ غفور کا ہے

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر/لاہور

نعت

احوال ہجر و قربِ طیبہ

ہجرِ طیبہ میں جو دیکھو مثلِ برگِ زرد ہوں
قُربِ طیبہ پاؤں تو پھر میں مہکتا درد ہوں
ہجرِ طیبہ میں لگے جیسے مجسّم درد ہوں
قُربِ طیبہ میں مگر خوشیوں میں ڈوبا فرد ہوں
ہجرِ طیبہ میں لگیں موسم خزاں آمیز سب
قُربِ طیبہ میں مگر پاتا بہارِ بَرد ہوں
قُربِ طیبہ میں شگفتہ رو دلِ بشاش ہوں
ہجرِ طیبہ میں بجھا چہرہ، دلِ پُردرد ہوں
قُربِ طیبہ میں ملے فرحت کا عالم ہر گھڑی
ہجرِ طیبہ میں غمِ فرقت سے گھائل فرد ہوں
قُربِ طیبہ میں سراپا التجا و شوق ہوں
ہجرِ طیبہ میں دلِ پرسوز و آہِ سرد ہوں
قُربِ طیبہ میں ملے تسکینِ دل تسکینِ جاں
ہجرِ طیبہ میں مثالِ نالۂ پُر درد ہوں
شامِ فرقت ختم ہو اور صبحِ طیبہ ہو نصیب
پھر کہوں فضلِ خدا سے میں بھی جیتا فرد ہوں

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر/لاہور

بڑھ جاتا ہے جینے کا امکان مدینے میں
ہو جاتی ہے ہر مشکل آسان مدینے میں
عاصی ہوں اگرچہ میں گر اِذنِ حضوری ہو
بن جائے گا بخشش کا سامان مدینے میں
لے لے گا پناہوں میں ہر بے سروساماں کو
پھیلا ہے جو رحمت کا دامان مدینے میں
کیا کوئی زمانے میں نام اُس کا مٹا پائے
جس شخص کو مل جائے پہچان مدینے میں
وہ شہرِ دل و جاں کا محور ہے اسی باعث
رہتے ہیں رسولوں کے سلطان مدینے میں
کیا خوشبوئیں پھیلی ہیں، کیا کیفِ مسلسل ہے
سرکارؐ کے روضے پر ہر آن مدینے میں
سیراب ہوا ہے وہ الطاف کی بارش سے
اک پل بھی جو ٹھہرا ہے انسان مدینے میں
دل جذب کی حالت میں رہتا ہے ہر اک لمحہ
ہوتا ہے ترو تازہ ایمان مدینے میں
اک اور ہی عالم سے ہوتا ہے گزر اُس کا
بن جاتا ہے جو اُن کا مہمان مدینے میں

علی رضا/ساہیوال

سلام

منقبت امامِ عالی مقام

میں کیا بتاؤں کیا مرے امام کا مقام ہے
سلام کا مقام ہے، سلام کا مقام ہے
امام کا جو نام نامی لب پہ آ گیا تو پھر
بڑے ادب کی بات، احترام کا مقام ہے
ہم ایسوں کو ابھی بھلا خبر کہاں یہ ہو سکی
امام کا مقام کس مقام کا مقام ہے
عطا ہوئی ہے جو انہیں ہمیشگی کی رفعتیں
فنا کے دشت میں یہی دوام کا مقام ہے
انہی کے دم سے تو ورق ورق پہ زندہ آج بھی
دمشق و کربلا کا اور شام کا مقام ہے
مرا شرف کہ منقبت امام کی لکھی جو نہی
خوشی ہوئی کہ کیا مرے سلام کا مقام ہے
امام کے مقامِ عالی مرتبت کے سامنے
میں جانتا ہوں کیا مرے کلام کا مقام ہے

نسیم سحر/لاہور

ظلم و ستم کی شب میں ہے روشن دیا حسینؑ
تاریکیٔ حیات کو بخشے ضیا حسینؑ
اشکوں کی ترجمانی سے آئے گا وہ سمجھ
عقل و خرد خیال سے ہے ماورا حسینؑ
اوراق جب پلٹتی ہے تاریخ کے ہوا
کہتی ہے برملا کہ ہے سب سے جدا حسینؑ
وہ پاسبانِ دینِ مبیں، جاں نثارِ حق
سینہ سپر کفار کے آگے رہا حسینؑ
منظر کسی بھی آنکھ سے دیکھا نہیں گیا
جب کربلا کی نذر ہوا پھول سا حسینؑ
تا بہ ابد مٹا نہیں سکتا یزیدِ وقت
زندہ ہے اور زندہ رہے گا سدا حسینؑ
اے کاش میں بھی ہوتا ظفر واں شریکِ جنگ
جب سب سے لڑ رہا تھا اکیلا مرا حسینؑ

انجینئر ظفر محی الدین/لاہور

شبِ عاشور

عاشور کی شب مرکزی خیمے میں بلا کر
فرمانے لگے شاہؑ چراغوں کو بجھا کر
ہے جان جسے پیاری چلا جائے بچا کر
روکیں گے اسے اکبرؑ و عباسؑ نہ جا کر
''یہ میری اجازت ہے کوئی عار نہیں ہے
یوں چھوڑ کے جانے پہ کوئی بار نہیں ہے''

میں مالکِ کوثر بھی ہوں، تسلیم و رضا بھی
میں شارحِ توحید و نبوت بھی عطا بھی
میں رحمتِ عالم سے شبیہِ جود و سخا بھی
میں وارثِ حرمین تو میں قبلہ نما بھی
''الحق علیؑ اور مع الحق ہے اگر حق
پھر میری اجازت یہ نہیں کچھ بھی مگر حق''

جو تم پہ مرا حق ہے وہ کرتا ہوں معطل
جو وعدۂ اجداد ہے کرتا ہوں مکمل
حق آدمؑ و خاتمؐ کا ہوا مجھ میں مُشکّل
میں وارثِ حیدرؑ ہوں تو حجت ہوں مدلل
''جو تم پہ مرا حق ہے اسے چھوڑ رہا ہوں
آلام کا رخ اپنی طرف موڑ رہا ہوں''

جنت جسے درکار ہے وہ اس کو ملے گی
راضی بہ رضا میری رضا ساتھ چلے گی
وعدہ ہے مرا ماں سے شفاعت بھی کرے گی
پھر احمدؐ و حیدرؑ کی معیّت بھی رہے گی
''درکار مخالف کو مری جان فقط ہے
یہ تم سے جدا ہونے کا عنوان فقط ہے''

گو میں بھی سمجھتا ہوں محبت یہ تمہاری
قربیٰ سے محبت بھی، عقیدت یہ تمہاری
صد لائقِ تکریم مؤدّت یہ تمہاری
یہ عشق و جنون اور مروت یہ تمہاری
''بچ جاؤ، چلے جاؤ، نکل جاؤ یہاں سے
عباسؑ انھیں کہہ دو سنبھل جاؤ یہاں سے''

کل دن میں جو ہوگا میں اسے دیکھ رہا ہوں
اکبرؑ، کہیں عباسؑ پڑے دیکھ رہا ہوں
انصار تو اعوان گرے دیکھ رہا ہوں
نیزوں پہ بہتّر کو سجے دیکھ رہا ہوں
''میں جان تمہاری تو بچا سکتا ہوں آخر
جو حق ہے مرا تم پہ، اٹھا سکتا ہوں آخر''

زینبؑ سرِ عریان بھی کیا دیکھ سکو گے؟
جلتے ہوئے قرآن بھی کیا دیکھ سکو گے؟
بے سر پڑے انسان بھی کیا دیکھ سکو گے؟
روندیں اُنھیں حیوان بھی کیا دیکھ سکو گے؟
''تقریر مکرّر ہے چلے جاؤ یہاں سے
تم لوگ تو بچ جاؤ گے اس بارِ گراں سے''

قربیٰ کی مؤدّت میں یہ احسان کریں گے
دن چڑھتے ہی پامال یہ قرآن کریں گے
انجام سے لاغرض یہ نادان کریں گے
فرعون کو، نمرود کو حیران کریں گے
''کل دن میں یہ امت مرا حق دے کے رہے گی
حیدر سے عداوت میں سبق دے کے رہے گی''

انصار سے، اعوان سے نظروں کو ہٹا کر
عباسؑ کے ہاتھوں سے چراغوں کو بجھا کر
پھر مرکزی خیمے کی طنابوں کو اٹھا کر
شبیرؑ نے خطبہ یہ دیا دل کو بڑھا کر
''اب حکمِ حسینؑ تھا چراغوں کو جلا دو
اور خیمۂ توحید کے پردوں کو گرا دو''

جب خیمۂ جاناں کے چراغوں کو جَلایا
اِس فرش نے افلاک کو منظر یہ دکھایا
ہر شخص نے تلوار کو گردن سے لگایا
اک سانس بھی شبیرؑ کے بن ہو نہ خدایا
''تلوار ہر اک شخص نے گردن پہ دھری ہے
کہنے لگے اس وار سے ہر نفس بری ہے''

منظر یہ فرشتوں نے، خدا نے بھی یہ دیکھا
عشق اور مُؤدّت نے، وفا نے بھی یہ دیکھا
غیرت نے، حَمیّت نے، انا نے بھی یہ دیکھا
کن اَکھیوں سے ابلیس و جفا نے بھی یہ دیکھا
''موجود تھے انصار تو اعوان تھے موجود
دنیا میں بہتر ہی تو انسان تھے موجود''

دل گیر حسینؑ ابن ولیؑ نے بھی یہ دیکھا
صد شکرِ خدا زینِؑ علیؑ نے بھی یہ دیکھا
زینبؑ نے، سکینہؑ سی کلی نے بھی یہ دیکھا
بقیہ نے، مدینے کی گلی نے بھی یہ دیکھا
''زینبؑ کو بندھی آس کہ عباسؑ سلامت
عباسؑ سلامت ہے تو اک آس سلامت''

آغا ظہور عباس/لاہور

شب وداع وہاں جو غلام تھے موجود
چراغ بجھ کے جلا جب تمام تھے موجود
یہ امتحان انوکھا تھا، امتحانوں میں
دیارِ عشق تھا، ذی احتشام تھے موجود
سبھی تھے شوقِ شہادت کے استعارے اور
بصد خلوص، بصد اہتمام تھے موجود
بدن، بدن کو تمنا تھی جاں نثاری کی
نظر، نظر کو مسلسل سلام تھے موجود
قبول کرتے ہوئے جاں پہ جاں کے نذرانے
بوقتِ عصر، اکیلے امامؑ تھے موجود
گزر رہے تھے مصائب کی آزمائش سے
جو خانوادۂ خیرالانام تھے موجود
ابھی صدائے ستم گر کا شور بڑھنا تھا
جلے ہوؤں میں ابھی کچھ خیام تھے موجود
عجائباتِ زمانہ پہ بات سنتے ہوئے
سناں سوار کے لب پر کلام تھے موجود
گواہی دینے لگے روشنی کے حق میں سبھی
طویل راہ میں جتنے قیام تھے موجود
خطاب کرنا پڑا سن کے آیتِ ''عز'' کو
وقوعہ والے بھی دربارِ شام تھے موجود
صعوبتیں تھیں، قفس تھا، زباں بندی تھی
مسافروں کے لیے انتظام تھے موجود
ابھی تو کرب و بلا دیکھنا تھے اور آکاشؔ
مدینہ جانے سے پہلے بھی کام تھے موجود

احمد سبحانی آکاشؔ/لاہور

نذرانہ عقیدت بحضور امام حسین علیہ سلام

علیؑ کی آل کے چرچے زمین و آسمانوں پر
حسینؑ خوف طاری ہے یزیدی شاخسانوں پر
نبیؐ کے پاک شانوں کا سوارِ اتنا معزز ہے
کہ جس کرنی ہے سرداری بھی جنت کے جوانوں پر
محرم کی یہ دسویں تو بنی ہے یوں نشانِ غم
بہاریں بھی خزاں لاتی ہیں اس دن گلستانوں پر
وہ دھوکے باز کوئی تو ندامت میں ہی ڈوبے ہیں
ملامت ان کی خاطر ہے زمانے کی زبانوں پر
شہادت کر بلا والی جدا ہے ہر شہادت سے
شجاعت ناز کرتی ہے بہترؔ تن کی جانوں پر
حسینؑ یاد دنیا کو لہو بسملؔ! رلاتی ہے
کہاں ماتم نہیں ہوتا، ستم کی داستانوں پر

عبدالوحید بسملؔ/ایبٹ آباد

نذرانۂ عقیدت بحضور امام عالی مقام

کوئی رُت ہو ہنسی نہیں آتی
انؑ کے غم میں کمی نہیں آتی
جس میں ہم ہوں غمِ حسینؑ نہ ہو
ایسی کوئی گھڑی نہیں آتی
ہائے زندان عابد بیمار
کہیں سے روشنی نہیں آتی
ہائے معصوم گردنوں میں تیر
ہچکی بھی دوسری نہیں آتی
اس طرف لحن خطبہ ء زینب
اس طرف بات بھی نہیں آتی
کربلا وہ مقام صبر و رضا
جس جگہ زندگی نہیں آتی
علم عباسؑ کا نہ ہو جس میں
اب نظر وہ گلی نہیں آتی
غم شبیرؑ کی بجز گریہ
ترجمانی کبھی نہیں آتی
بعد قتل امام غم کی حسنؔ
اب خبر آخری نہیں آتی

حسن عباسی/لاہور

سیرتِ طیبہ کا مطالعہ محض تاریخی واقعات سے واقفیت حاصل کرنے کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک مسلمان کے لیے اپنی زندگی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ مبارکہ کے مطابق ڈھالنے کا ذریعہ ہے۔ قرآنِ کریم نے ہمیں جس ہستی کی اطاعت، محبت اور اتباع کا حکم دیا ہے، ان کی حیاتِ مبارکہ ہی دینِ اسلام کی عملی تفسیر ہے۔ اس لیے سیرت کا مطالعہ ہر دور میں امت کی بنیادی ضرورت رہا ہے۔

ڈاکٹر طارق سلیم کی تصنیف ''سیرتِ معلمِ انسانیت'' کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں سیرتِ نبوی ﷺ کے اہم واقعات کو عام فہم اور سلیس اسلوب میں اس ترتیب سے پیش کیا گیا ہے کہ قاری ابتدا سے اختتام تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک زندگی کے مختلف مراحل سے بآسانی واقف ہوتا چلا جاتا ہے۔ مصنف نے محض واقعات نقل کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان سے حاصل ہونے والے عملی اور اخلاقی اسباق کی بھی نشاندہی کی ہے، جس سے کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔

خصوصی طور پر یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اس کتاب کی زبان نہایت آسان ہے، لیکن اس کی کوشش یہ رہی ہے کہ سیرت کے بنیادی اور معروف واقعات کو مستند مآخذ کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ آج کے دور میں، جب نوجوان نسل کو دین کی صحیح اور قابلِ اعتماد معلومات کی ضرورت ہے، ایسی تصانیف یقیناً مفید ثابت ہوسکتی ہیں۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو قبول فرمائے، اسے مصنف کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، اور اس کتاب کو پڑھنے والوں کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت، سنت کی اتباع اور دین پر عمل کا جذبہ پیدا فرمائے۔

محمد تقی عثمانی

رئیس دارالعلوم کراچی

✦✦✦

''سیرتِ معلمِ انسانیت'' ایک ایسی کاوش ہے جو رسول اللہ ﷺ کی مبارک زندگی کو نہایت سادہ، رواں اور عام فہم انداز میں پیش کرنے کی ایک قابلِ قدر کوشش ہے۔ آج کے دور میں جب فکری الجھنیں، اخلاقی بحران اور روحانی اضطراب بڑھتا جا رہا ہے، ایسے میں سیرتِ نبوی ﷺ ہی وہ واحد سرچشمۂ ہدایت ہے جو انسانیت کو حقیقی سکون، توازن اور کامیابی عطا کر سکتی ہے۔

مصنف ڈاکٹر طارق سلیم نے اس کتاب میں رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کو نہ صرف تاریخی ترتیب کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ ہر باب کے ساتھ ایسے اسباق بھی شامل کیے ہیں جو قاری کو اپنی عملی زندگی سے جوڑتے ہیں۔ یہی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ یہ محض مطالعہ نہیں بلکہ عمل کی دعوت دیتی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس پوری انسانیت کے لیے کامل نمونہ ہے۔ آپ ﷺ کی زندگی عدل، رحمت، صبر، عفو، دیانت، مساوات اور حُسنِ اخلاق کا وہ مثالی مجموعہ ہے جس کی مثال دنیا کی کسی اور شخصیت میں نہیں ملتی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کو اسوۂ نبوی ﷺ کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔

پبلشر قلم فاؤنڈیشن نے بھی اس کتاب کی اشاعت میں جس محنت، عقیدت اور حُسنِ ذوق کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ کتاب کی طباعت اور پیشکش کا معیار اس بات کی علامت ہے کہ سیرتِ طیبہ کی خدمت ایک مقدس ذمہ داری ہے جسے نہایت احترام کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔

میں امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب قارئین کے دلوں میں رسول اللہ ﷺ کی محبت، آپ کی سیرت کو سمجھنے کا شوق اور اس پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا کرے گی اور یہ کاوش امت کے لیے ہدایت اور اصلاح کا ذریعہ بنے گی۔

اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائے اور ہمیں سیرتِ نبوی ﷺ کو اپنی زندگیوں میں نافذ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

حافظ نعیم الرحمٰن

امیر جماعت اسلامی

✦✦✦

کتابیں صرف معلومات نہیں دیتیں، وہ انسان کے اندر ایک نئی دنیا بھی آباد کرتی ہیں۔ لیکن کچھ کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو صرف ذہن کو نہیں، دل کو بھی بدل دیتی ہیں۔ سیرتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہی میں سے ایک ہے۔

مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا ہے کہ ہمارے نوجوانوں کے پاس کامیابی کے بہت سے ماڈلز ہیں، مگر کردار کا سب سے بڑا ماڈل ان کی نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ حالانکہ اگر کوئی نوجوان رسول اللہ صلی اللہ علیہ

CamScanner

وآلہ وسلم کی زندگی کو سمجھ لے تو اسے قیادت بھی ملتی ہے، تعلقات نبھانے کا سلیقہ بھی، مشکلات میں ثابت قدم رہنے کا حوصلہ بھی، اور انسانوں سے محبت کرنے کا ہنر بھی۔

ڈاکٹر طارق سلیم کی کتاب ''سیرتِ معلمِ انسانیت'' کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ یہ قاری پر علمی بوجھ نہیں ڈالتی، بلکہ اسے آہستہ آہستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک زندگی کے سفر میں اپنے ساتھ لے کر چلتی ہے۔ ہر واقعے کے بعد پیش کیے گئے اسباق قاری کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ سیرت صرف پڑھنے کے لیے نہیں، جینے کے لیے بھی ہے۔

میرا یقین ہے کہ اگر ہم اپنے بچوں کو صرف سیرت کے واقعات سنانے کے بجائے ان واقعات کے پیچھے موجود اخلاق، حکمت، صبر، رحم، دیانت، قیادت اور محبت کو سمجھا دیں تو ہماری نئی نسل کے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو سکتے ہیں۔ ہمیں معلومات سے زیادہ کردار کی ضرورت ہے، اور کردار کی بہترین درسگاہ سیرتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔

میں ڈاکٹر طارق سلیم کو اس خوبصورت کاوش پر مبارک باد دیتا ہوں کہ انہوں نے سیرتِ نبوی ﷺ کو آسان، مؤثر اور قابلِ فہم انداز میں پیش کیا ہے۔ اسی طرح قلم فاؤنڈیشن کے چیئرمین علامہ عبدالستار عاصم بھی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کو عمدہ طباعت اور خوبصورت پیکیجنگ کے ساتھ قارئین تک پہنچانے کا اہتمام کیا۔ اچھی کتابیں لکھنا بھی خدمت ہے اور انہیں خوبصورتی سے شائع کرنا بھی ایک بڑی خدمت ہے۔

میری دعا ہے کہ ''سیرتِ معلمِ انسانیت'' ہر گھر تک پہنچے، ہر نوجوان کے ہاتھ میں آئے، ہر استاد کی میز پر ہو اور ہر والدین اپنے بچوں کو یہ کتاب تحفے میں دیں۔ اگر اس کتاب کو پڑھ کر ایک بھی انسان اپنی زندگی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ مبارکہ کے مطابق ڈھالنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو مصنف اور ناشر دونوں کی محنت بار آور ہو جائے گی۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبول فرمائے، اسے لاکھوں دلوں کے لیے ہدایت، محبتِ رسول ﷺ اور بہترین کردار کا ذریعہ بنائے۔

سید قاسم علی شاہ

✦✦✦

کچھ کتابیں صرف پڑھی جاتی ہیں، لیکن کچھ کتابیں انسان کی سوچ، کردار اور زندگی کا رخ بدل دیتی ہیں۔ "سیرتِ معلمِ انسانیت" انہی کتابوں میں شامل ہے۔ یہ محض سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واقعات کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر قاری اپنی زندگی کو دیکھ سکتا ہے اور اسے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے مطابق ڈھالنے کی ترغیب پاتا ہے۔

آج کا انسان ترقی کی بلندیوں کو تو چھو رہا ہے، لیکن اخلاق، برداشت، دیانت، عدل، محبت، اور انسانیت جیسی اقدار سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ ایسے حالات میں ہمیں کسی نئے فلسفے یا نظریے کی ضرورت نہیں، بلکہ اس معلمِ انسانیت کی تعلیمات کی ضرورت ہے جس نے جہالت میں ڈوبی ہوئی دنیا کو علم، اخلاق اور انصاف کا روشن راستہ دکھایا۔

ڈاکٹر طارق سلیم نے نہایت سادہ، رواں اور عام فہم انداز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک زندگی کو اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر واقعے کے ساتھ اس کا عملی پیغام اور زندگی کے لیے رہنمائی بھی موجود ہے۔ یہی چیز اس کتاب کو دیگر سیرت کی کتابوں سے ممتاز بناتی ہے۔

قلم فاؤنڈیشن ہمیشہ اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ کتابیں صرف شائع نہیں کی جاتیں بلکہ معاشروں کی تعمیر کرتی ہیں۔ جب ہمارے سامنے "سیرتِ معلمِ انسانیت" کا مسودہ آیا تو ہمیں محسوس ہوا کہ یہ کتاب ہر گھر، ہر تعلیمی ادارے، ہر مدرسے اور ہر لائبریری تک پہنچنی چاہیے۔ اسی احساس کے تحت ہم نے اسے خوبصورت طباعت اور بہترین معیار کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کی۔

ہماری خواہش ہے کہ یہ کتاب صرف پڑھی نہ جائے بلکہ اس پر عمل بھی کیا جائے، کیونکہ سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اصل مقصد معلومات میں اضافہ نہیں بلکہ کردار کی تعمیر ہے۔

میں ڈاکٹر طارق سلیم کو اس قیمتی علمی خدمت پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے، اسے لاکھوں دلوں میں محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا کرنے کا ذریعہ بنائے اور اسے مصنف، ناشر اور تمام معاونین کے لیے صدقۂ جاریہ قرار دے۔

اگر اس کتاب کے ذریعے ایک نوجوان بھی سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وابستہ ہو گیا، ایک گھر بھی سنتِ نبوی کا گہوارہ بن گیا، یا ایک دل بھی عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منور ہو گیا، تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری یہ کاوش بارگاہِ الٰہی میں قبول ہو گئی۔

علامہ عبدالستار عاصم

✦✦✦

CamScanner

گھبرائے گی زینبؑ

منشی چھنولال دلگیر

غالباً 1956ء کے محرم میں ریڈیو پاکستان سے یہ نوحہ مرحوم ناصر جہاں نے اپنی پرسوز آواز میں پہلی بار پڑھا تھا۔ اس نوحے کو عوام میں اتنی زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کے بعد جب تک ناصر جہاں حیات رہے، وہ خود یہ نوحہ پڑھتے رہے اور اب ان کے صاحبزادے اسد جہاں اور ان کے ساتھ ساتھ ساری دنیا کے نوحہ خوان یہ نوحہ پڑھتے ہیں۔

اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ نوحہ آلِ رضا صاحب کا لکھا ہوا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ نوحہ لکھنو کے ایک ہندو شاعر چھنو لال دلگیر کا لکھا ہوا ہے۔ جو 1888ء میں مطبع نول کشور سے شائع ہونے والی کلیاتِ دلگیر کی پہلی جلد میں موجود ہے۔ میاں دلگیر 1847ء میں وفات پاگئے تھے۔ گویا کہ یہ نوحہ تقریباً دو سو سال پرانا ہے اور جب ہی سے لکھنو اور اس کے اطراف میں برپا ہونے والی مجالس میں پڑھا جاتا رہا ہے۔ مگر ناصر جہاں صاحب کی پرتاثیر آواز اور ریڈیو پاکستان کی نشریات کے ساتھ یہ نوحہ دنیا بھر میں مقبول ہوگیا۔

گھبرائے گی زینبؑ
بھیا تمہیں گھر جا کے کہاں پائے گی زینبؑ
کیسا یہ بھرا گھر ہوا برباد الٰہی
کیا آئی تباہی
اب اس کو نہ آباد کبھی پائے گی زینبؑ
پوچھیں گے جو سب لوگ کہ بازو کو ہوا کیا
یہ نیل ہے کیسا
کس کس کو نشاں رسی کے دکھلائے گی زینبؑ
بے پردہ ہوئی قید بھی خواہر نے اٹھائی
اور موت نہ آئی
کیا جانئے کیا کیا ابھی دکھ پائے گی زینبؑ
پھٹ جائے گا بس دیکھتے ہی گھر کو کلیجہ
یاد آ کے گے بھیا
دل ڈھونڈے گا تم کو تو کہاں پائے گی زینبؑ
گھر جا کے کسے دیکھے گی قاسمؑ ہے نہ عباسؑ
اکبرؑ سے بھی ہے آس
اپنے علی اصغرؑ کو کہاں پائے گی زینبؑ
بن بیٹوں کے کہلای تو کہلائی میں لیکن
یہ کیسے ہو ممکن
بن بھائی کے کہلائی تو مر جائے گی زینبؑ
گھبرائے گی زینبؑ

❀❀❀

ماہنامہ الحمرا لاہور

بہ یادِ حضرت مولانا حامد علی خاں

ادب کا چراغ، روایت کا امین یہ رسالہ حضرت مولانا حامد علی خاں رحمہ اللہ کی یادگار کے طور پر شائع کیا جاتا ہے۔

لاہور کا معروف ادبی رسالہ جو برسوں سے اردو ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے۔

ادب نواز شخصیت شاہد علی خاں کی زیرِ ادارت

شاعری، افسانہ، تنقید، تحقیق، تراجم، محفلِ احباب، خصوصی گوشے، ہر شمارہ ایک نیاز اویہ، ایک نئی خوشبو

اگر آپ ادب سے محبت رکھتے ہیں یا خود کو قلم سے جوڑنا چاہتے ہیں تو ماہنامہ ''الحمرا'' میں آپ کا پرخلوص خیر مقدم ہے!

اپنی تخلیقات ارسال کریں اور اردو ادب کے اس قافلے کا حصہ بنیں

J-24 ماڈل ٹاؤن لاہور، 0333-4001844

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی: علم و تحقیق کا جہانِ دیگر

ڈاکٹر علی محمد خاں/ لاہور

قائداعظمؒ کے بارے میں ہر کس و ناکس جانتا ہے کہ ہر چند وہ دیکھنے میں بڑے دھان پان تھے مگر عزم و حوصلہ کے کوہِ گراں تھے۔ ہم اسی وصف کا اطلاق بغیر کسی ردّ و کد اور سوچ بچار کے پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی ذات پر کر سکتے ہیں کیوں کہ وہ بھی قائداعظمؒ کی طرح نحیف و نزار تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ بلند حوصلگی میں اک پہاڑ تھے تو یہ علم و تحقیق کے مردِ میدان تھے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی میرے دوست تو کم مگر مربّی و محسن زیادہ تھے۔ وہ ایک طویل مدّت سے تادمِ واپسیں میرے ہمدمِ دیرینہ، رفیق کار اور شریک مصنف ڈاکٹر عبدالغنی فاروق کے ہم سائے تھے۔

بہت پرانی بات ہے کہ مَیں ایک مرتبہ، شاید آج سے پچیس تیس سال پہلے ڈاکٹر عبدالغنی فاروق کے گھر، واقع منصورہ (ملتان روڈ، لاہور) گیا۔ ابھی مَیں ان کے مین گیٹ پر کھڑا بات چیت کر رہا تھا کہ مجھے اسی چوراہے میں سامنے کی طرف دو تین گھر چھوڑ کر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، جنھیں مَیں اورینٹل کالج کے ایک ہر دل عزیز استاد اور ماہرِ اقبالیات کی حیثیت سے جانتا تھا، اپنے گھر میں داخل ہوتے نظر آ گئے۔ مَیں چونکا اور ان کے بارے میں ڈاکٹر عبدالغنی فاروق سے دریافت کیا تو انھوں نے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بتایا:

ہاں! یہی ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ہیں، جو اورینٹل کالج میں پڑھاتے ہیں۔ شاید آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ہم اورینٹل کالج میں کلاس فیلو تھے، جہاں نامور مصنف جناب عطاء الحق قاسمی) بھی ہمارے کلاس فیلو اور معروف شاعر امجد اسلام امجد ہم سے ایک سال جونیئر تھے۔ ہاشمی صاحب کچھ عرصہ تو گورنمنٹ سیکٹر کے مضافات کے مختلف کالجوں میں پڑھاتے رہے مگر وہ گھوم پھر کر آج کل اورینٹل کالج میں پڑھاتے ہیں۔ ہم دونوں ایک مدّت سے محلّے دار ہیں۔ آپ یہ سن کر شاید مزید حیران ہوں گے کہ میری دیکھا دیکھی، ہاشمی صاحب نے بھی، جو پہلے کرائے پر رہتے تھے، پلاٹ لے کر منصورہ ہی میں گھر بنالیا اور اب ہم ایک طویل عرصے سے ہم سائے ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں کہ: ہم سایہ، ماں جایا، میرا اُن سے قریبی تعلق ہے اور یہ جان کر آپ شاید مزید حیران ہوں گے کہ پنجاب یونیورسٹی کے سالنامے محور کی مجلس ادارت کے ہم بیک وقت چار مدیران تھے: گلزار وفا چودھری، رفیع الدین ہاشمی، عطاء الحق قاسمی اور عبدالغنی فاروق۔ ہم چاروں ہی کلاس فیلو تھے اور میرے پی ایچ۔ڈی تھیسس کے انٹرنل سپروائزر بھی ہاشمی صاحب ہی تھے۔ اگر آپ چاہیں گے تو مَیں آپ کو ان سے ملوا دوں گا۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، مَیں نے ان سے کہا کہ ہاں ضرور، کب ملوائیں گے؟ انھوں نے کہا کہ آج تو نہیں، مَیں ان سے وقت لے لوں گا اور ہم ان شاء اللہ اسی ہفتے ملاقات کرلیں گے۔ چلو اللہ دے اور بندہ لے، اس دن تو مَیں نصاب کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالغنی فاروق سے ضروری مشاورت کے بعد اپنے گھر لوٹ آیا لیکن میرے ذہن میں کھُد بُد تھی کہ جب ہماری دوبدو ملاقات ہوگی تو مَیں ان سے کیا پوچھوں گا۔ خیر، تیسرے ہی دن ڈاکٹر عبدالغنی فاروق کی کال آ گئی کہ مَیں نے ہاشمی صاحب سے رابطہ کیا ہے، انھوں نے کہا ہے کہ اتفاق سے آیندہ جمعہ، ہفتہ، اتوار اوپر تلے تین چھٹیاں آ گئی ہیں، آپ ان میں سے کسی دن بھی تشریف لے آئیں، مَیں گھر پر ہی ملوں گا لیکن بہتر یہ ہے کہ، بشرطیکہ وقت آپ کو بھی یاوری کرے تو بہتر یہ ہوگا کہ جمعے کو گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک آ جائیں، ہم کچھ دیر اکٹھے وقت گزاریں گے اور پھر منصورہ کی جامع مسجد میں ایک ساتھ جمعہ بھی پڑھ لیں گے۔

قصہ کوتاہ مَیں وقتِ مقرّرہ پر ڈاکٹر عبدالغنی فاروق کے گھر پہنچ گیا اور وہ مجھے اپنی ہم سائیگی میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے گھر لے گئے اور اُن سے علیک سلیک کے بعد یہ کہتے ہوئے:

سپردم بہ تُو مایہ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را

اپنے گھر لوٹ گئے اور ہاشمی صاحب مجھے اپنے گھر کے اس کمرے میں لے کر آ گئے جو اُن کا اصل ٹھکانہ تھا اور اُن کا گھر میں زیادہ تر وقت وہیں گزرتا تھا۔ کمرہ کیا تھا، ایک رزم گاہ تھی کیوں کہ ہاشمی صاحب کو شاید وہیں بیٹھ کر نت نئی باتیں سوجھتی تھیں اور وہ وہیں بیٹھ کر بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑاتے تھے۔ مَیں نے دیکھا کہ وہاں پر ہر سُو کتابیں ہی کتابیں بکھری پڑی تھیں اور ساتھ ہی ان کا وہ دستی بیگ پڑا تھا جس کا انھیں سفر و حضر کسی بھی حال میں اپنے سے جُدا کرنا کبھی گوارا نہ تھا بلکہ جسے ایک واقف کار نے اُسے عمرو عیّار کی زنبیل قرار دیا تھا۔ مجھے لگا کہ ہاشمی صاحب میرے بارے میں پہلے ہی سے بہت کچھ جانتے ہیں اور ان کے علم میں تھا کہ میرا اوڑھنا بچھونا بھی پڑھنا پڑھانا اور لکھنا لکھانا ہے اور شاید یہ بھی ان کے علم میں تھا کہ مَیں گورنمنٹ کالج آف سائنس وحدت روڈ لاہور

سے ریٹائر ہو کر ایف۔ سی کالج میں پڑھاتا ہوں کیوں کہ انھوں نے مجھ سے بیٹھتے ہی پہلے یہ پوچھا: سنائیں ! آغا سہیل کے ایف سی کالج کا آج کل کیا حال ہے؟ مَیں نے کہا : آغا سہیل تو ایف سی کالج سے کب کے ریٹائر ہو چکے اور آج تک ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں۔ مَیں پچھلے دنوں اُن کے یہاں گیا تھا، وہاں اُس دن انڈیا سے رتن سنگھ اور اُن کی بیگم آئے ہوئے تھے۔ ہم نے اکٹھے ہی برنچ کیا تھا۔ بات کاٹ کر بولے : یہ برنچ کیا ہوتا ہے؟ عرض کیا کہ بریک فاسٹ اور لنچ ایک ساتھ کرنے کو عرفِ عام میں برنچ کہتے ہیں۔ کہنے لگے : خوب اور پھر قدرے تامل کے بعد گویا ہوئے : رتن سنگھ کو شاید آپ پہلے نہیں جانتے ہوں گے۔ وہ کسی زمانے میں روزنامہ آفتاب کے مدیرِ اعلیٰ اور پھر آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل ہو گئے تھے۔ وہ اُردو اور پنجابی کے اَچھوتے شاعر ہونے کے علاوہ اُردو کے بہت عمدہ افسانہ و ناول نگار بھی ہیں۔ ان کے افسانوں کا رنگ ڈھنگ وہی ہے جو راجندر سنگھ بیدی کا تھا۔ مَیں نے ہاشمی صاحب کے مُنھ سے رتن سنگھ کے، جن کا نام بھی زندگی میں مَیں نے پہلی بار سنا تھا اور اُن سے آغا سہیل کے گھر میری دو بدو ملاقات بھی اتفاقاً ہو گئی تھی، یہ انوکھی معلومات افزا باتیں سنیں تو میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا اور مَیں دل ہی دل میں ہاشمی صاحب کی علمیت اور ایک تن ناتواں میں حد درجہ یادداشت کا قائل ہو گیا اور مَیں نے دل ہی دل میں طے کر لیا کہ مَیں اس شخص سے حتی الوسع میل جول رکھوں گا۔ پوچھا : آج کل ایف سی کالج میں پڑھانے کے علاوہ کیا لکھ رہے ہیں؟ عرض کیا : آج کل تو تمام تر توجہ سیکنڈ ایئر کی کتاب سرمایہ اردو کی تسوید و ترتیب اور اس کی نظرِ ثانی پر ہے۔ میرے علاوہ ڈاکٹر عبدالغنی فاروق اور پروفیسر جعفر بلوچ شریک مصنف ہیں۔ کہنے لگے : جعفر بلوچ کے کیا کہنے، ایک درویش آدمی ہے۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ سو سنار کی ایک لوہار کی جعفر بلوچ کا اطلاق اس ضرب المثل پر ہوتا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں آپ تینوں کے تعاون سے یہ کتاب بہت اچھی بنے گی۔

مجھے معلوم بھی نہیں پڑا کہ ہاشمی صاحب نے گھر میں چائے کا کب کہہ دیا تھا۔ خیر خوش گپیوں کے ساتھ ہم چائے کی بھی چُسکیاں لینے لگے۔ مَیں نے موقع غنیمت جانا اور پوچھ ہی لیا کہ اگر مناسب سمجھیں تو بتایئے کہ اورینٹل کالج کی پروفیسری اور صدرِ شعبہ ہونے تک آپ کو کتنے پاپڑ بیلنا پڑے اور یہ سفر کیسے طے ہوا؟ کہنے لگے : یہ ایک ایسی داستان ہے جسے بیان کرنے کے لیے وقت اور حوصلہ درکار ہے۔ اگر طبع پر گراں نہ گزرے تو عرض کروں کہ آج تو یہ موضوع رہنے دیں، ہم کسی اور دن یہ باتیں کر لیں گے۔ آج مجھے ایک ضروری کام بھی ہے، وہ نمٹا لوں۔ مَیں اُسی وقت اُن کی بات سمجھ گیا اور چائے جلدی جلدی ختم کی اور اُٹھ جانے ہی میں عافیت سمجھی۔

اگلی اتوار کو جب مَیں ڈاکٹر عبدالغنی فاروق کے گھر گیا تو مناسب سمجھا کہ وقت دے دیں تو مَیں ہاشمی صاحب سے بھی کچھ باتیں کر لوں گا، چناں چہ مَیں ڈاکٹر عبدالغنی فاروق کی ہم راہی میں ہاشمی صاحب کے گھر گیا۔ انھیں شاید میرے آنے کی بھنک پڑ گئی تھی۔ اپنے گھر سے نکلتے ہی اندر آ جانے کا کہا تو ڈاکٹر عبدالغنی فاروق تو اپنے گھر چلے گئے اور ہم ان کی رزم گاہ (رزم گاہ کا لفظ مَیں نے دوبارہ دانستہ استعمال کیا ہے) میں آ بیٹھے۔ اس سے پہلے کہ مَیں باتوں کا سلسلہ وہیں جوڑ لیتا جہاں پچھلی بار ٹوٹا تھا، ہاشمی صاحب نے خود ہی بات چھیڑ دی۔ کہنے لگے :

آپ نے یہی پوچھا تھا ناں کہ مَیں نے اورینٹل کالج کے صدرِ شعبہ بننے تک کا سفر کیسے طے کیا تو یہ ایک عزم و ہمت کی داستان ہے جو خاصی طوالانی ہے مگر میں مختصراً عرض کرتا ہوں : میری ولادت تلہ گنگ سے بجانب شمال مغرب ایک گاوں مصریال میں فروری کو ہوئی تھی جو سرکاری کاغذات میں سہواً یا عمداً یکم اپریل ء لکھی گئی۔ میرے والدِ ماجد کا نام محمد محبُوب شاہ ہاشمی اور والدہ محترمہ کا گُل بیگم تھا جو مجھے اس وقت ہی داغِ مفارقت دے گئی تھیں جب میں ابھی تین ساڑھے تین سال کا تھا اور مجھے آغوشِ مادر سے محرومی کا احساس ساری عمر رہا۔ وہ میرے آبائی گاوں مصریال ہی میں آسودہ خاک ہیں۔ میرا جب کبھی مصریال جانا ہوتا ہے تو میں ان کی قبر پر جا کر دعائے مغفرت ضرور کرتا ہوں۔

میرے والد چوں کہ شاہ رفیع الدین ہاشمی دہلوی کے بڑے معتقد تھے، اس لیے انھوں نے میرا نام انھی کے نام پر تجویز کیا تھا تا کہ نام کے اثر سے اُن کی خوبُو کا کوئی نہ کوئی حصّہ مجھے بھی مل جائے۔ میرے دادا جان ایک معمولی کاشتکار تھے جو کاشتکاری کا پیشہ ترک کر کے مسجد میں بچّوں کو قرآن مجید کی تعلیم دینے لگے تھے۔ میں بھی ان سے پڑھتا تھا۔ انھی کی تاکید و اصرار سے مَیں نے چھٹ پنے ہی میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا جسے مَیں اپنی زندگی کے یادگار و خوش گوار لمحات میں شمار کرتا ہوں۔ حفظِ قرآن کی تکمیل کے بعد دُنیوی تعلیم کی طرف آیا اور میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج سرگودھا سے ، میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس اور سکالرشپ حاصل کیا۔ دبلا پتلا تو میں تھا ہی، اسی دوران میں کمزوری اور بیماری نے آن لیا اور تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ چناں چہ بی اے کا امتحان پرائیویٹ طور پر پاس کیا اور ایم اے اردو کرنے کے

CamScanner

لیے گورنمنٹ کالج سرگودھا میں داخل ہو گیا مگر کہ سُن کرلاہور کے اورینٹل کالج میں مائگریشن کرالی اور میں یہیں سے ایم اے اُردو میں فرسٹ ڈویژن لی اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ آپ کو ایک سرے کی بات بتاؤں؟ اسی سال آپ کے استاد گرامی سجّاد باقر رضوی نے بھی، جو اسلامیہ کالج سول لائنز میں انگلش کے ٹیچر تھے اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خاں انھیں اورینٹل کالج میں لے آئے تھے اور ہمیں تنقید پڑھایا کرتے تھے، ایم اے اُردو کا امتحان دیا تھا اور ان کی سیکنڈ ڈویژن آئی تھی۔

مَیں نے میں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ میرا موضوعِ تحقیق: تصانیفِ اقبال، تحقیقی و توضیحی مطالعہ تھا اور میرے مقالے کے نگران ڈاکٹر وحید قریشی تھے۔ اس مقالے نے میرا مستقبل تعیّن کرنے میں میری مدد کی۔ میں آپ کو ایک اور مزے کی بات بتاؤں، وہ یہ کہ پی ایچ۔ڈی کرنے کے بعد مَیں نے ہومیو پیتھک طریق علاج میں بھی باقاعدہ ڈپلوما اور ترکی زبان میں باقاعدہ سَرٹیفکیٹ حاصل کیا تھا۔ بچپن ہی سے میرا غالب رجحان لکھنے کی طرف رہا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ جب مَیں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا تو مَیں نے گلستانِ سعدی سے ماخوذ ایک حکایت لکھی تو جو ماہنامہ نور میں چھپی تھی اور یہ سلسلہ بفضل تعالیٰ آج تک جاری وساری ہے اور ان شاءاللہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک فرشتہ اجل میرے ہاتھ سے قلم چھین نہیں لیتا۔

جہاں تک پڑھانے کا تعلق ہے، مَیں نے بڑے بڑے کالجوں میں پڑھایا ہے۔ مَیں کسی زمانے میں ایف سی کالج میں بھی پڑھاتا رہا اور جب ۰ ء میں میری پنجاب پبلک سروس کمیشن سے بطورِ اردو لیکچرر سلیکشن ہوگئی تو پہلے ڈیڑھ سال تک گورنمنٹ کالج مری اور پھر نو سال تک گورنمنٹ کالج سرگودھا میں، جہاں سے مَیں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا تھا، پڑھایا اور پھر میرا تبادلہ گورنمنٹ کالج لاہور ہو گیا جہاں مَیں نے دو سال تک تدریسی فرائض انجام دیے۔ بعد ازاں میں نے ء میں اورینٹل کالج کا رخ کرلیا جہاں میں صدرِ شعبہ بھی رہا اور سروست بھی اسی ادارے سے بحیثیت وزٹنگ پروفیسر منسلک ہوں۔

یہاں تک سنا کہ ہاشمی صاحب تھوڑی دیر کو رُکے۔ جس کا میرے نزدیک مفہوم یہ تھا کہ مَیں ان کی مزید سمع خراشی نہ کروں، چناں چہ مَیں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اجازت لے کر اپنے رفیق کار ڈاکٹر عبدالغنی فاروق کے گھر آ گیا اور ہم سرمایہ اردو کے معاملات نمٹانے لگے۔

اب جب کہ اس بات کو بیس بائیس سال کا عرصہ گزر گیا ہیاور وہ دونوں ہم جماعت اور ہم سائے ڈھائی سال ہوئے ء میں محض تین ماہ کے وقفے میں راہیِ ملکِ عدم ہوئے ہیں۔ مجھے کیا پتا تھا کہ مَیں ان دونوں کا ایک ایک مبسوط خاکہ لکھوں گا (یاد رہے کہ مَیں اس سے قبل ڈاکٹر عبدالغنی فاروق کا خاکہ لکھ چکا ہوں، جو اردو کے معروف رسائل و جرائد میں چھپ چکا ہے اور یہ بڑی خوش آیند بات ہے کہ ڈاکٹر عبدالغنی فاروق کی علمی و ادبی خدمات کے موضوع پر لاہور کی ایک یونیورسٹی کے پلیٹ فارم سے پی ایچ۔ڈی کا تحقیقی مقالہ اپنے آخری مراحل میں ہے۔(

جہاں تک میرے علم میں ہے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی صحت کبھی بھی قابلِ رشک نہیں رہی بلکہ صحت کے مسائل نے انھیں ساری عمر ہی الجھائے رکھا اور ان کی حیاتِ مستعار کا زیادہ تر زمانہ صحت کے مسائل سے نبرد آزما ہونے ہی میں بسر ہوا۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ سرگودھا کے ٹی بی ہسپتال میں کچھ عرصہ اور پھر ایک سال تک کوہستانِ مری میں ساملی سانا ٹوریم (SAMLI SANATORIUM)) میں داخل رہے مگر حیران کن بات یہ ہے کہ انھوں نے کسی بھی حالت میں لکھنے لکھانے کے کام کو نہ چھوڑا بلکہ مَیں نے بہ تحقیق سنا ہے کہ کسی زمانے میں ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ وہ ایک ماہ تک بیساکھیوں کے سہارے چلتے رہے، تو بھی انھیں گوارا نہ ہوا کہ وہ اپنی صحت کے مسائل کے پیشِ نظر لکھنے لکھانے کے کام کو وقتی طور پر خیرباد کہ دیں بلکہ انھوں نے اس کام کو پورے انہماک سے جاری رکھا۔ گویا لکھنے لکھانے اور علم و تحقیق کا کام اُن کی گھٹی میں پڑا تھا۔

تاہم ابدی حقیقت ہے کہ ہر متنفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی شدید علالت کے باعث جنوری ء کو اپنے نواحی منصورہ ہسپتال میں داخل ہوئے مگر وہ جو کہتے ہیں کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی اور علاج معالجے سے کوئی افاقہ نہ ہوا بلکہ جنوری ء کو اُن کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ رہے نام اللہ کا۔

جس کسی نے اُن کی وفات کا سنا، وہی دل مسوس کر رہ گیا۔ تعزیت کے لیے ہزاروں لوگ، جن میں اکثریت ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں کی تھی، ان کی قیام گاہ- ڈی منصورہ پہنچ گئے۔ ایک جنازہ تو جنوری ء کو ظہر کی نماز کے بعد جامع مسجد منصورہ ہی میں پڑھا گیا جب کہ دوسرا جنازہ پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس کی وسیع و عریض واکنگ ٹریک گراؤنڈ میں ان کے ایک شاگرد رشید پروفیسر ڈاکٹر زاہد منیر عامر نے پڑھایا، جس میں راقم الحروف نے بھی اپنے دوست ڈاکٹر اشفاق احمد کے ساتھ شرکت کی اور انھیں وہیں پنجاب یونیورسٹی کے قبرستان میں سپردِ خاک کردیا

CS CamScanner

گیا۔اس موقع پر ہر شخص کی زبان پر کم و بیش یہی الفاظ تھے کہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی علم و تحقیق کا جہانِ دیگر تھے،ان کے بعد ان کا بدل ملنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

دراصل ہاشمی صاحب مرحوم کے ساتھ میری علیک سلیک اس وقت ہوئی جب مَیں نے ء میں پی ایچ۔ڈی کرنے کے لیے پروفیسر سجاد باقر رضوی کا دامن پکڑا تھا اور مجھے ہر دوسرے تیسرے دن سجاد باقر رضوی کو ملنے کے لیے اورینٹل کالج جانا پڑتا اور مَیں اورینٹل کالج کے تقریباً تمام اساتذہ کرام کو بخوبی جانتا تھا۔یہ اُس زمانے کی بات ہے جب فخر الحق نوری اور مرغوب حسین طاہر اور سجاد باقر رضوی تینوں لوگ ایک ہی کمرے میں بیٹھتے تھے اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صدرِ شعبہ تھے۔اس زمانے میں فخر الحق نوری ن م راشد کے موضوع پر پی ایچ۔ڈی کرنے کے لیے پر تول رہے تھے اور ان کے ساتھ اس موضوع پر کبھی کبھی اس لیے بات ہو جاتی تھی کہ ن م راشد میرے پی ایچ۔ڈی کے موضوع :لاہور کا دبستانِ شاعری کے ایک اہم شاعر تھے اور میں بھی اس موضوع کے حوالے سے کسی نہ کسی بات کی کرید میں ان کے پاس جاتا تھا۔ مَیں دیکھتا تھا کہ ہاشمی صاحب اپنے شاگردوں میں گھرے رہتے تھے اور وہ اپنے شاگردوں کی کڑوی کسیلی باتوں کا بھی خندہ جبینی سے جواب دیتے تھے۔ پھر جس دن مَیں نے سُنا کہ حیدر آباد (دکن) میں علاّمہ اقبال کے حوالے سے ایک اقبال انٹرنیشنل سیمینار منعقد ہو رہا ہے جس میں ہاشمی صاحب کو بھی مدعو کیا گیا ہے تو مجھ پر ان کا ماہرِ اقبالیات ہونے کا پہلو بھی دل میں پیوست ہو گیا۔بس پھر تو یہ ہوا کہ مجھے جب بھی ہاشمی صاحب سے بات چیت کا موقع مُیسّر آیا تھا،میں ان سے اقبالیات کے موضوع پر کچھ نہ کچھ الٹی سیدھی بات کر لیتا، جس کا وہ اپنے خاص انداز میں بڑے تحمل سے جواب دیتے تھے۔

خیر وقت گزرتا گیا تا آنکہ میں مجھے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری کا حق دار قرار دیا گیا۔انھی دنوں ایک دن مجھے ہاشمی صاحب اورینٹل کالج میں سرِ راہ ملے تو انھوں نے مجھے ڈاکٹر ہونے کی پُر جوش مبارک باد دی اور کہا کہ ہم دونوں اس خوشی میں کسی دن کیفے ٹیریا جائیں گے اور چائے پییں گے۔اس دعوت پر میری اُن کے ساتھ عقیدت کا رنگ اور بھی گہرا ہو گیا۔

وہ جو کہتے ہیں کہ وقت اور جوار بھاٹا کسی کے روکے نہیں رکتے اور وقت تیزی سے گزر جاتا ہے۔ ان دنوں مَیں ایف سی کالج یونیورسٹی میں صدرِ شعبہ اُردو تھا اور میرے سر پر کچھ احباب کے خاکے لکھنے کا بھوت سوار تھا۔چناں چہ مَیں یونیورسٹی میں اپنے آفس میں تا دیر بیٹھا رہتا اور یہی کام کرتا رہتا۔یہاں تک کہ میری خاکوں پر مشتمل پہلی کتاب اب انھیں ڈھونڈ تیار ہو گئی اور جب کتاب کے فلیپ لکھنے کا مرحلہ درپیش آیا اور مَیں نے اپنے دوست ڈاکٹر تحسین فراقی سے اس بارے میں مشورہ کیا تو انھوں نے تُرت جواب دیا کہ ایک تو فلیپ مَیں لکھ دوں گا، دوسرے آپ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کو کہیں، ان کی نظروں سے آپ کے تمام خاکے گزر چکے ہیں، وہ بغیر کسی حیص بیص کے جلد ہی لکھ دیں گے۔ چناں چہ مَیں اسی دن منصورہ گیا اور اپنے رفیقِ کار ڈاکٹر عبد الغنی فاروق کی وساطت سے انھیں ملا۔انھوں نے فوراً ہامی بھر لی اور کہنے لگے: مَیں ضرور بالضرور لکھ دوں گا۔آپ کل کسی وقت تشریف لائیں اور مجھ سے فلیپ لے لیں۔ چناں چہ حسبِ وعدہ مجھے فلیپ مل گیا۔انھوں نے میری کتاب اب انھیں ڈھونڈ کے بارے میں مختصر اور جامع فلیپ لکھا تھا جس کے لیے میں اُن کا آج تک سپاس گزار ہوں۔ہاشمی صاحب کی من و عن تحریر یہ ہے:

ڈاکٹر علی محمد خاں کا تعلق مولانا حالی کے وطن پانی پت سے ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ وہ (مولانا) حالی کی طرح بلا کے محنتی اور ایک تسلسل کے ساتھ کام کرنے والے صاحبِ قلم ہیں۔ان کی تحریروں میں وہی سادگی اور دھیما پن موجود ہے جو مولانا حالی کی نثر کا خاصا ہے۔مَیں نے انھیں بہت با کمال شخص قرار دیا ہے کیوں کہ مولانا حالی جیسی شخصیت سے کسی بھی طرح کی نسبت قائم ہو جانا خوش بختی اور کمال کی بات ہے۔

ڈاکٹر علی محمد خاں کا زیرِ نظر مجموعہ اُن کی والدہ، دوست احباب اور رفقائے کار کے خاکوں پر مبنی ہے، انھوں نے اپنے بقول امکان بھر کوشش کی ہے کہ کسی خاکے کے کسی جملے سے کسی کی دل آزاری نہ ہو۔اس لیے وہ اسے گلشن بے خار کہتے ہیں۔اگر چہ خار کے بغیر گلشن کا تصوّر ذرا مشکل ہے لیکن ڈاکٹر علی محمد خاں کے اس گلشن میں واقعی کوئی کانٹا نہیں ہے۔با ایں ہمہ ڈاکٹر صاحب نے ان کی خوبیاں اور اوصاف پوری تفصیل اور جزئیات کے ساتھ بیان کر دیے ہیں جو اُن کے قوی حافظے کی دلیل ہیں۔ان خاکوں میں مرحومین کے ساتھ مصنّف کا جذباتی لگاؤ ایک زیریں لہر کے طور پر موجود ہے (ہر چند) ان خاکوں کی شخصیات سے ایک محدود حلقے سے تعلق رکھتی ہیں مگر ڈاکٹر صاحب کے قلم نے انھیں حیاتِ جاوداں بخش دی ہے، اور ان سے خود ڈاکٹر علی محمد خاں کا نام خاکہ نگاری کی تاریخ میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

مَیں یہ کہتا ہوں کہ مَیں نے ہاشمی صاحب کے لکھے ہوئے کو کئی بار پڑھا اور میرا ایک سیر خون بڑھ گیا۔

جب ء میں میری اسی سلسلے کی دوسری کتاب یہ

عنوان : چراغِ رُخِ زیبا اشاعت کے آخری مراحل میں تھی تو مَیں ایک بار پھر منصورہ جا کر ہاشمی صاحب کو ملا اور اپنا مُدّعا بیان کیا تو انھوں نیا سی وقت کھڑے کھڑے مجھے مشورہ دیا کہ اُسی فلیپ کا پہلا اور آخری پیراگراف لے لیں، کافی وشافی ہوگا۔ ہاں البتہ اس کے اوپر آج کی تاریخ : جولائی ء، لکھ دینا۔ مَیں یہ کہتا ہوں کہ وہ جو فارسی ضرب المثل ہے کہ :

کارِ امروز بفردا مگزار اس کے مفہوم کا مَیں اسی دن تو قائل ہوا تھا۔

اس واقعے کے کچھ ہی دنوں بعد کی بات ہے کہ مجھے ہاشمی صاحب کا فون آیا : مَیں نے پچھلے دنوں آپ کی کتاب : چراغِ رُخِ زیبا کے بارے میں ایک صفحے کا تبصرہ لکھا تھا، جو اس ماہ کے الحمرا میں چھپ بھی گیا ہے۔ الحمرا آپ کے پاس آتا ہوگا، اس میں دیکھ لینا اور جی چاہے تو میرا شکریہ بھی ادا کر دینا۔ یہ شاید کے کسی مہینے کی بات ہے۔ مَیں نے مطلوبہ الحمرا دیکھا تو مَیں بھونچکا رہ گیا کیوں کہ ایک تو ہاشمی صاحب نے میری طرف سے گزارش کیے بغیر ہی یہ سب کچھ اپنے طور پر لکھا تھا اور بقول مرزا غالبؔ :

بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے

اور پھر جن الفاظ میں میری کتاب کے ایک ایک خاکے کا نام لے کر تعریف و توصیف لکھی تھی، وہ اس پر مستزاد تھا۔ افسوس تو اس بات کا ہے مَیں اپنی لاپروائی کے سبب وہ تبصرہ شیٹ سنبھال کر نہ رکھ سکا ورنہ ان کے الفاظ آپ لوگوں کے گوش گزار ضرور کرتا اور آپ و بتاتا کہ ہاشمی صاحب کا یہ وتیرہ تھا کہ وہ اپنے سے منسلک و مربوط اُردو لکھاریوں کی کس قدر حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

اس موقع پر میرے لیے لازم تھا کہ مَیں یہاں ہاشمی صاحب کی عادات واطوار کے علاوہ ان کی علمی و ادبی خدمات کے حوالے سے ان کے علم و تحقیق کے تمام پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ان کے کارہائے نمایاں بالخصوص ان کی تصانیف کا تفصیلی ذکر کرتا لیکن مَیں یہ سب کچھ ان کے سوانح نگار کے لیے چھوڑتا ہوں اور میر تقی میر کے ان الفاظ میں اس جگہ یہ کہتا ہوں کہ :

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

ہاں البتہ اس جگہ اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے اپنے دوست ڈاکٹر خالد ندیم کی ایک نظم بہ عنوان : کہاں ہے اب وہ کوزہ گر؟ کا درج ذیل ابتدائی بند پیش کرتا ہوں :

کہاں ہے اب وہ کوزہ گر؟
جو ہر دن اک نیا کوزہ بناتا تھا
پھر اس کو اپنی سانسوں کی حرارت سے پکاتا تھا
چلیں ڈھونڈیں وہ کوزہ گر
کہ خشک کوزوں کو نگاہوں کے کئی رنگوں سے یوں رنگین کرتا تھا
کہ سب حیران ہوتے تھے
فقط حیران نہیں، ان کو پریشانی بھی ہوتی تھی
وہی مٹی، وہی گارا، وہی حدت، وہی روغن
مگر ناکام رہتے تھے
کہ یہ خونِ جگر ان میں شامل کرتا رہتا تھا
تبھی تو کوزوں میں حرارت زندگانی کی سبھی محسوس کرتے تھے
کہاں ہے اب وہ کوزہ گر؟
کہاں ہے اب وہ کوزہ گر؟

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْن

دل میں اِک زخم کو پالے ہوئے ہیں
پھر بھی چہرہ تو اجالے ہوئے ہیں
اپنے اندر کے توازن سے ہم
اِک سمندر کو سنبھالے ہوئے ہیں
لذتِ ہجر سے نکلے ہی نہیں
یہ جو ہم وصل کو ٹالے ہوئے ہیں
اپنی آواز بھی سنتے نہیں اب
کن خلاؤں کے حوالے ہوئے ہیں
عمر گزری ہے تعاقب میں ترے
جیسے نظروں میں بھی چھالے ہوئے ہیں
نام بخشا تھا جنھیں میں نے کبھی
وہ بڑا نام اچھالے ہوئے ہیں
کچھ تو رہنا ہے تکبر زاہدؔ
ہم بھی جنت سے نکالے ہوئے ہیں

زاہد محمود زاہد/ملتان

دیکھو گے کہاں روز یہ نذرانے ہمارے
بھرتے ہی نہیں آنکھ کے پیمانے ہمارے
یہ سوچ کے پھر اٹھا وہ ملاح کا بیٹا
تھکنے کے لیے ہوتے نہیں شانے ہمارے
دنیا میں علاج ان کا کوئی ہے کہ نہیں ہے
گر جاتے ہیں نظروں سے جو دیوانے ہمارے؟
جو وعدے کیے اور نبھائے نہیں تم نے
ہیں آپ کی جانب بڑے ہرجانے ہمارے
تم بارِ دگر سوچ لو پھر آنکھ ملاؤ
عادت کے بڑے ضدی ہیں یہ رانے ہمارے
اپنوں سے گلہ ہے نہ ہمیں غیر سے شکوہ
کھا جاتے ہیں دکھ اپنے ہی مرجانے ہمارے

راؤ وحید اسد

ڈاکٹر علی محمد خاں کی داستانِ حیرت کا قصہ

ڈاکٹر جمیل الرحمٰن/لاہور

مشہور انگریزی نقاد ڈبلیو ایچ ہڈسن کا قول ہے کہ ہر شخص کم از کم ایک دل چسپ کتاب لکھ سکتا ہے اور وہ ہے اس کی آپ بیتی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک عام آدمی کی زندگی اکثر و بیشتر اتنی سپاٹ اور غیر دل چسپ ہوتی ہے کہ عام قاری کو اس میں خاص کشش محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ وہ زندگی جو ہنگاموں میں گزری ہو، جس میں رعنائیوں کے ساتھ کچھ خار بھی دامن گیر ہوئے ہوں، جس کے شب و روز میں لطف اندوز ہونے اور غور و فکر کا سامان موجود ہو، ایسی زندگی گزارنے والوں کی متاعِ حیات ہر ایک کو اپنی جانب کھینچنے کا ہنر جانتی ہے اور اگر یہ سب نہیں تو میر کے ہمنوا بن جایئے:

کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میر
جہاں میں تم آئے تھے، کیا کر چلے

ڈاکٹر علی محمد خاں نے اپنی آپ بیتی لکھنے کا خطرہ مول لیا ہے۔ اس پیرانہ سالی میں رنگِ شباب گھل مل گیا ہے۔ ایک روز ان سے ملاقات ہوئی تو مَیں نے پوچھا:

ڈاکٹر صاحب ! آپ نے اپنی نئی تصنیف کس کے نام معنون کی ہے؟

انھوں نے لحہ بھر توقف کیا، پھر دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئے:

اپنی شریکِ حیات و ہم سفر فاخرہ چغتائی کے نام، جنھوں نے چوّن برس تک میرا ساتھ نبھایا اور پھر مجھے زندگی کے شدائد کا تنِ تنہا مقابلہ کرنے کے لیے چھوڑ گئیں۔ آپ نے وہ شعر سنا ہے ناں!

اس سے پوچھو عذاب رستوں کا
جس کا ساتھی سفر میں بچھڑا ہے

یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے داستانِ حیرت میری جانب سرکائی اور فرمایا:

وقت ملے تو اس کتاب کے اوراق ضرور پلٹنا، اس میں میرے پرکھوں اور میری زندگی کی کہانی بند ہے۔ میں نے عرض کیا:

جی ضرور، میری خوش بختی ہوگی کہ میں آپ کی شخصیت کا مطالعہ کروں۔

میں نے کتاب اٹھائی اور اس کے اوراق شوق سے پلٹنے لگا۔ اچانک میری نظر شاد عظیم آبادی کے اس شعر پر جا ٹھہری:

میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے، آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

یوں محسوس ہوا گویا ڈاکٹر صاحب نے اپنی آپ بیتی کا عنوان اسی شعر سے اخذ کیا ہو۔ تاہم ڈاکٹر صاحب کی باغ و بہار شخصیت کے لیے میں یہ شعر بطورِ خاص پیش کرنا چاہوں گا کیونکہ وہ اس تحسین کے بجا طور حق دار ہیں:

لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک
اے اہلِ زمانہ قدر کرو، نایاب نہ ہوں کم یاب ہیں ہم

ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب ان کی طویل زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ انھوں نے نامساعد حالات میں زندگی کا آغاز کیا اور بقول ان کے: میں دنیا کے چاروں کھونٹ خوب گھوما پھرا ہوں۔ انھوں نے ہندو سندھ اور شرق و غرب کے سفر کیے، تعلیم و تدریس کا پیشہ اختیار کیا اور تصنیف و تالیف کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ اس آپ بیتی کا مقصد خودستائی اور مبالغہ آمیز تعریف و توصیف ہرگز نہیں، اس بارے میں انھوں نے آغاز میں ہی لکھ دیا کہ:

میرے دل و دماغ کے کسی کونے کھدرے میں بہت عرصے سے یہ خیال جاگزیں تھا کہ جہاں آج تک ان گنت خودنوشتیں ضابطہ تحریر میں آ چکی ہیں، ان میں اگر ایک مزید شامل ہو جائے گی تو اس میں کیا قباحت ہے۔ کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ فی زمانہ اس کارزارِ حیات میں جہاں پرانی قدریں تیزی سے اٹھتی جا رہی ہیں اور چاروں طرف آپا دھاپی کا شور و غوغا اور اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے، مَیں نے جس قدر محنت کی ہے اور جس مقام و مرتبہ پر پہنچا ہوں، میری زندگی بھی شاید کچھ بھٹکنے والے لوگوں کے لیے اندھیری شب میں قندیلِ راہبانی کا کام دے سکے۔

داستانِ حیرت میں انھوں نے محض واقعات بیان نہیں کیے بلکہ اپنے تمام کرداروں اور حالات کی مرقع کاری کی ہے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے اور بعد کے ماہ و سال کو پوری تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انھیں اس بات پر بجا طور پر فخر ہے کہ ان کا تعلق مولانا حالی کے وطن پانی پت سے ہے۔ پانی پت کس طرح پہنچے، اس کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے جدِ امجد کا تعلق دراصل ملتان یا اوچ شریف کے کسی نواحی علاقے سے تھا۔ وہ کسی بزرگ کے ہاتھ پر ہندو سے مسلمان ہوئے اور بھائی بندوں کے مظالم سے تنگ آ کر پانی پت کی جانب ہجرت کر گئے۔ جب ہندوستان تقسیم ہوا تو ایک مرتبہ پھر ان کے گھرانے کو ہجرت کی کلفت سے گزرنا پڑا اور یوں ڈاکٹر علی محمد خاں اپنے باپو اور گھر کے دیگر افراد کے ہمراہ پاکستان چلے آئے۔

انھوں نے تقسیم ہند کے المیے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی اور جھیلا بھی۔ ہندو مسلم فسادات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئے تھے اور جان و مال اور عزت و آبرو بچانے کی صرف ایک ہی راہ دکھائی دیتی تھی کہ مسلمان دوبارہ اپنا آبائی دھرم اختیار کر لیں۔

داستانِ حیرت ڈاکٹر صاحب کے گاؤں بترانوالی کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے۔ بچپن کی سہانی

یادیں، معصوم شرارتیں اور کتاب، کاغذ اور قلم سے پہلی آشنائی کے نقوش اسی گاؤں کی مٹی میں محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر علی محمد خاں کو بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پانچویں، آٹھویں اور دسویں جماعت میں وظیفہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ایک سعادت مند بیٹے کا کردار انھوں نے خوب نبھایا۔ اپنے تمام بہن بھائیوں میں سے وہ سب سے زیادہ اپنے باپو اور ماں جی کے قریب رہے، اسی لیے والدین کی دعائیں اور فیضانِ نظر کا وافر حصّہ بھی ان کے نصیبے میں لکھا تھا، ان کے بقول:

مجھے باپو سے پرانے چشم دید واقعات، ماں جی سے چڑیا چڑے کی نوعیت کی کہانیاں سننے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ باپو سے میں نے ایک ہی واقعہ اور ماں جی سے ایک ہی کہانی شاید بیسیوں دفعہ سنی ہو گی لیکن نہ تو کبھی انھوں نے سنانے میں بخل سے کام لیا اور نہ کبھی میں نے حیل وحجت کی، بس انھیں ہمیشہ سنانے اور مجھے ہمیشہ سننے سے غرض رہی۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے والدِگرامی کی سادگی، بے باکی اور سخت جانی کو خوب بیان کیا ہے۔ ان کی واجبی سی تعلیم کے حوالے سے دل چسپ معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

باپو زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے البتہ انھوں نے اپنے گاؤں ڈاہر ہی میں ایک پادھا (پنڈت) سے ہندی (دیوناگری) کے حروفِ ابجد سیکھے تھے اور دو تین جماعتوں کے برابر ابتدائی پڑھت لکھت بھی کی تھی البتہ انھیں سوایا، ڈیڑھا، ڈھایا اور اونٹا (ساڑھے تین) کے پہاڑے خوب ازبر تھے جنھیں گاہے ماہے وہ مجھے سنایا کرتے تھے۔

انھوں نے اپنے عہد کے تعلیمی نظام اور طریق تدریس کو بڑی صراحت سے بیان کیا ہے۔ اس زمانے میں املا، انشا پردازی، خوش خطی اور ریاضی کی بنیادی باتیں سکھانے پر زور دیا جاتا تھا۔ قدیم وجدید دور کے تعلیمی تفاوت پر ان کا یہ تبصرہ بجا ہے کہ فی زمانہ اس نوعیت کی باتیں شہروں میں تو درکنار مضافات اور دیہات کے سکولوں میں بھی عنقا ہو کر رہ گئی ہیں۔

محنت، محنت اور مسلسل محنت ان کی زندگی کا اصول رہا ہے، حتیٰ کہ ان کی جاں فشانی کی گواہی ہر وہ شخص دیتا ہے جو ان سے واقف ہے۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے انھوں نے بچّوں کو پڑھانا شروع کر دیا تھا، جس سے زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھانے میں مدد ملتی رہی۔

ڈاکٹر صاحب کی زبانی مَیں نے یہ جملہ کئی بار سنا ہے:

........سر گاڑی، پاؤں پہیا کیا، تب یہ کتاب مکمل ہوئی ہے۔

یہ جملہ سنتے ہوئے بے اختیار ہنسی بھی آتی ہے اور اس کی حقانیت پر یقین بھی۔

ڈاکٹر صاحب کو سکول، کالج اور یونیورسٹی میں تدریس کا وسیع تجربہ حاصل ہے۔ کوٹلی لوہاراں، معراج کے اور پنڈی بھٹیاں میں تدریس کے فرائض انجام دیتے ہوئے وہ ایک عظیم استاد اور مشاق شکاری کے طور پر بھی سامنے آئے۔ بطور صیاد اپنی مہم جوئی سے آگاہ کرنے کے لیے انھوں نے اس کتاب میں بھوکے کو سوکھے ٹوک سہالیاں کا عنوان باندھا ہے۔ اس عجیب وغریب عنوان پر چونکا اور ذہن پر زور دیا کہ اس کا کیا مطلب ہے، بہرحال کوشش بسیار کے بعد میں اس کی تہ تک پہنچ ہی گیا یعنی بھوکے کے لیے خشک روٹی کے ٹکڑے روغنی نان سے کم نعمت معلوم نہیں ہوتی۔ یہاں ڈاکٹر صاحب نے پنڈی بھٹیاں، جلال پور بھٹیاں، حافظ آباد، سکھیکی اور خانقاہ ڈوگراں کے دیہی کلچر اور فطری ماحول کا نقشہ کہانی کے سے انداز میں کھینچا ہے، قاری اس سحر آگیں فضا میں کھو سا جاتا ہے۔ اسی عرصے میں انھیں سکّہ بند شاعر بننے کا شوق چرایا تاکہ مولانا حالؔی اور پانی پت سے نسبت کا کچھ بھرم رکھا جائے، ان کے شعری جنون کی کیفیت ان حالوں پہنچ چکی تھی:

......اس دن کے بعد میرا یہ معمول ہو گیا کہ میں صبح دیکھتا نہ شام، دن دیکھتا نہ رات، سفر دیکھتا نہ حضر، فکرِ شعر کرتا رہتا اور جب شکار کے لیے تنہا نکلتا اور جنگل بیلے میں سے گزر ہوتا تو اونچی آواز میں اپنے شعر الاپتا بلکہ میں نے شکار کو کارِ بیکاراں سمجھ لیا اور میرا دل آہستہ آہستہ اس شغل سے کھٹا ہونا شروع ہو گیا۔ انھی دنوں میں نے ایک بیاض بھی بنا لی جو دن رات میرے سرہانے دھری رہتی تاکہ جو کچھ طبع آزمائی کروں، ترت لکھ لوں۔

مجھے ذاتی طور پر ڈاکٹر صاحب سے یہ گلہ ہے کہ انھوں نے اپنے قارئین کو اپنی شاعری سے محروم رکھا۔ ان کا اپنا دیانت دارانہ خیال یہ تھا کہ ان کا کلام اگر مولانا حالؔی، داغؔ دہلوی اور حسرت موہانی کی ٹکر کا نہیں ہے تو ایسی شاعری سے کیا فائدہ لہٰذا اس شوق سے ہاتھ اٹھا لیا، یوں شاعر ہونے سے بال بال بچ گئے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی تمام تر توجہ نثر نگاری پر دینا شروع کر دی، اس کا ثمر شیریں اسّی سے متجاوز کتابوں کی صورت نکلا۔

ہوتے ہوتے ان کا تبادلہ لاہور ہو ہی گیا جہاں انھوں نے اپنی شبانہ روز محنت، اخلاص، خوش نویسی اور علمی وادبی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ انھوں نے اس دور کے قیام کی انمول یادوں کو بھی جزئیات کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ ان دنوں ان کا قیام پونچھ ہاؤس کالونی (لاہور) میں رہا۔ انھوں نے ماں جی سے جڑی یادوں کو بڑی دردمندی اور سوز وگداز سے تازہ کیا، یوں ماں جی کا مانوس خاکہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ جب ڈاکٹر صاحب علی محمد خاں سے ڈاکٹر علی محمد خاں بنے تو ان کی خوشی دیدنی تھی، ماں جی جو چٹی ان پڑھ تھیں، نے اس اعزاز پانے پر خوشی کا اظہار اس طرح کیا:

ماں جی نے ڈگری میرے ہاتھ سے لے لی۔

میرے ہاتھوں کو چوما اور اپنی آنکھوں سے لگایا.....
فرمائش کر کے مجھے پھندنے والی چوکور کیپ سمیت سرخ گاؤن پہنایا اور بے اختیار ہو کر گاؤن کے پلّو کو چوم لیا۔

کالج کیڈر میں قدم رکھا تو انھیں ایک مرتبہ پھر لاہور سے باہر نواحی اور قصباتی کالجوں میں آنے جانے کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ انھوں نے گورنمنٹ گرونانک میموریل کالج ننکانہ صاحب، انٹر کالج مترانوالی، گورنمنٹ کالج شیخوپورہ اور گورنمنٹ کالج آف سائنس وحدت روڈ لاہور میں طویل تدریسی خدمات سے وابستہ حالات و واقعات کا نقش نہایت دل چسپ انداز میں کھینچا ہے۔

اسی عرصے میں ان کی دوستی اپنے زمانے کے نامور اساتذہ اور اہلِ قلم سے رہی۔ ڈاکٹر علی محمد خاں نے پروفیسر عمر فیضی، پروفیسر جعفر بلوچ، پروفیسر احسان الٰہی سالک، ڈاکٹر معراج نیّر زیدی، پروفیسر عبدالجبار شاکر، پروفیسر حسن عسکری کاظمی، سید افسر حسین رضوی، پروفیسر نبوت یار خان اور افتخار احمد باجوہ کا بالخصوص ذکر کیا ہے اور ان کی بھرپور شخصیات پر نہایت مؤثر خاکے تحریر کیے ہیں۔

کالج کی دنیا سے آگے بڑھتے ہوئے ان کا اگلا پڑاؤ پاکستان کی عظیم درس گاہ ایف سی کالج، یونیورسٹی، لاہور تھی، اور وہاں سے سبکدوشی کے بعد بھی وزٹنگ فیکلٹی کے طور پر ان کا علمی سفر جاری ہے۔ یہاں رہتے ہوئے وہ ڈاکٹر پیٹر ہیڈن آرما کوسٹ اور چودھری احمد سعید سے کافی متاثر نظر آئے۔ ان دونوں صاحبان کی تعلیمی اور انتظامی صلاحیتوں کو خوب سراہا۔ ڈاکٹر پیٹر ایچ آرما کوسٹ پر انھوں نے نہ صرف عمدہ خاکہ لکھا بلکہ ایف سی کالج یونیورسٹی میں پڑھائی جانے والی اردو کی کتاب لکھ کر ان کے نام معنون کی کیونکہ امریکی ہونے کے باوجود انھوں نے پاکستان کی قومی زبان کی ترقی اور ترویج کے لیے اقدامات کیے تھے۔ جہاں تک چودھری احمد سعید کی شخصیت کا تعلق ہے تو اس کے لیے ڈاکٹر علی محمد خاں نے نہ صرف ان کی سوانح عمری سرنوشت کے نام سے لکھی بلکہ اپنے عزیز دوست رانا محمد یوسف سے کہہ کر اس کا اردو سے انگریزی زبان میں ترجمہ Legends live Forever کے نام سے کرایا۔

ڈاکٹر صاحب کی اکلوتی بیٹی ڈاکٹر فرح علی ان دنوں اپنے میاں اور دو بیٹیوں رجا فرحان اور ہبہ فرحان کے ساتھ آسٹریلیا میں مقیم ہیں، ڈاکٹر صاحب کی جان اپنی بیٹی میں اٹکی رہتی ہے، جب سے ان کی ہم سفر فاخرہ چغتائی انھیں داغِ مفارقت دے کر گئی ہیں، ان کا خیال ڈاکٹر فرح ہی رکھ رہی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب انھیں اپنی متاعِ حیات گردانتے ہیں۔ ڈاکٹر فرح اور ان کی والدہ مرحومہ کا تذکرہ جہاں تہاں شعوری اور لاشعوری طور پر تکرار کے ساتھ اس آپ بیتی میں ملتا ہے۔

ڈاکٹر علی محمد خاں نے پیشہ ورانہ اور غیر پیشہ ورانہ احباب اور اعزہ و اقربا کو نہایت محبت سے یاد کیا ہے، ان میں ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کا ذکر کافی مفصّل ہے اور کیوں نہ ہو، دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کی چلبلی نظمیں عجوہ کی رخصتی اور علی محبت خان داستان حیرت میں شامل ہیں۔ ایک اور علمی و ادبی شخصیت، جمالِ اردو ادب ڈاکٹر نجیب جمال کا ذکر انھوں نے بہت پیار سے کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے پانچ درویش اور صحبتِ مرہم کی ہفتہ وار بیٹھک کا بھی تعارف کرایا اور اس کی غرض و غایت بیان کی۔ اسی کتاب میں ان کے ہونہار تلامذہ کا بھی ذکر ملتا ہے، ان خوش نصیبوں میں رین بسیرا والے رانا نعمان اعجاز، عبدالرزاق ایازؔ (سابقہ سیکرٹری پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ)، محمد احمد (کریسنٹ کڈز کیمپس)، قاضی گروپ آف سکولز کے منتظمِ اعلیٰ قاضی نعیم انجم کے علاوہ دیگر احباب میں پروفیسر ایف ایم کیفی، عامر بن علی (جاپان) پروفیسر رانا محمد یوسف، طارق مرزا (آسٹریلیا)، ریحان علوی (آسٹریلیا)، ڈاکٹر عبدالغنی فاروق، محمد فیصل (منصرم اعلیٰ الفیصل ناشران)، چودھری احمد نجیب (کاروان بک ہاؤس) اور راقم الحروف کے نام شامل ہیں۔

ڈاکٹر علی محمد خاں خوش قسمت ہیں کہ انھوں نے کم و بیش دو لاکھ طلبہ کی رہ نمائی کی، انھیں کامیاب انسان بنایا، اس کے ساتھ ہی ان کا قلم مسلسل علمی، ادبی، تصنیفی، تالیفی اور درسی کتب کی تیاری کی صورت میں گراں بہا موتی بکھیرتا رہا۔

زندگی کے اس طویل سفر میں انھوں نے کبھی تھک کر ہمت نہیں ہاری۔ ان کی آپ بیتی ایک بہادر اور جفاکش انسان کی داستان ہے، شاہراہِ حیات پر ان کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ انھوں نے سخت آزمائش میں بھی یاس کو اپنے آس پاس پھٹکنے نہیں دیا، انھوں نے کبھی نہیں کہا کہ:

زندگی در گردنم افتاد، بیدلؔ چارہ نیست
شاد باید زیستن، ناشاد باید زیستن

(اے بیدلؔ! زندگی کا بوجھ میرے گلے پڑ گیا ہے، اب کوئی چارہ نہیں۔ خواہ خوشی سے جینا پڑے یا غم کے ساتھ، بہر حال جینا ہی پڑے گا۔)

ڈاکٹر علی محمد خاں کی داستانِ حیرت، ہم ایسے کوتاہ ہمت لوگوں کے لیے ایک سبق کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر نجیب جمال نے درست کہا کہ ڈاکٹر علی محمد خاں کی یہ خودنوشت پرکار کے دائرے کی طرح ہے جس میں دائرہ ان کا عہد اور اس دائرے کا مرکزی نقطہ وہ خود ہیں۔ سچ کہوں تو ڈاکٹر صاحب کی زندگی مرزا داغؔ دہلوی کے اس شعر کی عملی تصویر ہے:

یہ دل کی آگ ہے یا دل کے نور کا ہے ظہور
نفس نفس میں مرے روشنی نکلتی ہے

CamScanner

ڈاکٹر فاروق عادل کی خاکہ نگاری پر ایک نظر

قمر زمان/ایبٹ آباد

اردو میں خاکہ نگاری کی صنف بڑی ثروت مند ہے کہ اس کو ایک سے بڑھ کر ایک خاکہ نگار نصیب ہوا ہے۔یہاں تک کہ اس میں خود نوشت خاکوں کی بھی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔اس صنف کے ذخیرے میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے۔اسی سلسلے کی ایک کڑی خاکوں کا ایک تازہ مجموعہ دیکھا جنھیں پلٹ کے حال ہی میں منصۂ شہود پر آیا ہے جس کے مصنف ڈاکٹر فاروق عادل ہیں۔ان کا اصل میدان تو صحافت ہے لیکن انہیں خاکہ نگاری کی صنف سے بھی خاص رغبت ہے بلکہ وہ اس کے ماہر شاہ سوار ہیں۔اس کا ثبوت ان کے خاکوں کا یہ دوسرا مجموعہ ہے۔

آپ اس سے پہلے خاکوں کا ایک خوبصورت مجموعہ جو صورت نظر آئی 20217ء میں اردو ادب کی جھولی میں ڈال چکے ہیں جو اپنے عہد کے نامور اہل سیاست کے خاکوں پر مشتمل ہے۔اس مجموعے میں پینتیس افراد کے خاکے شامل ہیں۔جن میں پاکستانی سیاست کے سب ہی نامی گرامی سیاست دان شامل ہیں ان کے علاوہ ترکیہ کے صدر رجب طیب اردوان کا خاکہ بھی شامل ہے جو اردو داں طبقے کے لیے خاصے کی چیز ہے اور یہ فاروق عادل کی ترکوں سے محبت کی علامت ہے۔ان کا دوسرا مجموعہ حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے جس کی تخلیق ان کے ذہن رسا کا حاصل ہے کہ انہوں نے اپنے ممدوحین کے حوالے سے ایسے بامعنی عنوانات قائم کیے ہیں جو ان کی انشاء پردازی کی مہارت کا ثبوت ہیں۔اس کتاب میں کل سڑسٹھ خاکے شامل ہیں جن کو مختلف عنوانات میں اس خوبصورتی سے پرویا گیا ہے کہ قاری کی سوچ کو نئے زاویے عطا کرتا ہے۔مثلا سابقون الاولون میں مولانا سید ابوالاعلی مودودی ،نواب زادہ لیاقت علی خان اور سردار عبدالرحب نشتر کے خاکے ہیں جو نہ صرف ان اکابرین کے اوصاف کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ آج کے اہل سیاست کے لیے ایک معیار کا تعین کرتے ہیں کہ دراصل کاروبار سیاست میں ہم نے کیسے اجلے کردار کے لوگ پیدا کیے ہیں جن کی آج بھی مثالیں دی جاتی ہیں۔ان اکابرین کے کارہائے نمایاں کو اجاگر کیا ہے کہ جو آج ناپید ہیں۔مثلاً سردار عبدالرحب نشتر کے دیگر کارناموں کے ساتھ ساتھ ایک اہم کارنامہ انہوں نے یہ لکھا ہے کہ ہندوستان بھر کے ریلوے اسٹیشنوں کے اردو میں نام نشتر صاحب ہی کی وزارت موصلات کے دوران لکھے گئے۔

عبدالرب نشتر ایک مثالی کردار کی حامل شخصیت تھے۔ ان کی اصول پسندی کے کئی واقعات لکھے ہیں۔ایک جگہ لکھتے ہیں جب وہ وزیر تھے ان کے میز پر دو فون تھے ایک سرکاری تھا اور دوسرا ذاتی، ان کے بیٹے نے سرکاری فون اٹھالیا اور فون کرنے لگا تو اسے منع کیا کہ یہ سرکاری فون ہے، اس نے کہا کیا فرق پڑتا ہے لوکل کال ہے دونوں سے کوئی خرچ نہیں آتا، اس پر نشتر صاحب نے جواب دیا کہ غلط استعمال کی عادت تو پڑ سکتی ہے۔وزارتوں سمیت کئی اہم عہدوں پر رہنے کے باوجود انہوں نے ساری زندگی اپنا ذاتی مکان نہیں بنوایا۔لیاقت علی خان ملک کے وزیر اعظم تھے لیکن ان کے موزے پھٹے ہوتے تھے۔ان کے سیکرٹری نے بتایا کہ انہوں نے اپنے بیٹے کے کاروبار کے لیے رقم ادھار لی تھی ،انہوں نے نہ تو کوئی کلیم جمع کرایا اور نہ اس ملک کو اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کیا۔ان کے خاکوں میں کردار کی ایسی عظمت دکھائی دیتی ہے کہ معزز معاشرے اس پر رشک کریں۔ جناب شیر باز مزاری، مولانا سمیع الحق اور سید منور حسن کے خاکے ان شخصیات کی زندگیوں کے ایسے گوشے وا کرتے ہیں جو قاری کی معلومات میں بے پناہ اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ کردار و عمل کا ایک اعلی معیار بھی قائم کرتے ہیں۔سردار شیر باز مزاری کتب کے رسیا تھے اور انہیں آپ بیتیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا خاص طور پر قفقار کے مجاہد امام شامل کی آپ بیتی ، بینجمن فرینکلن اور مارک ٹوئن کی آپ بیتیاں انھیں پسند تھیں۔نعمت اللہ ایڈووکیٹ کے خاکے میں کراچی کے بہت سارے حالات کے علاوہ بطور میئر ان کی خدمات کو بھی سراہا ہے اس کے ساتھ ساتھ کئی اہم انکشافات بھی اس میں شامل ہیں۔اسی طرح سید منور حسن کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ پہلے ترقی پسند تھے اور کارل مارکس، ٹرائسکی اور لینن سے متاثر تھے یہ سب باتیں آج کے قاری کے لیے نئی ہیں۔مولانا سمیع الحق اور مولانا فضل الرحمان کے حوالے سے کئی اہم معلومات بھی ان کے خاکے میں شامل ہیں۔جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے اس عنوان کے تحت اہل سیاست کے عمدہ خاکے لکھے ہیں، جن میں نواب زادہ نصر اللہ، نواز شریف، آصف درداریؒ، ممنون حسین ،عمران خان اور اس طرح کی کئی اہم شخصیات شامل ہیں۔ڈاکٹر فاروق عادل کو سیاست کی راہداریوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے اس لیے بہت کچھ آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا لکھا ہیجو پاکستانی سیاست کی تفہیم کے لیے اہمیت کا حامل ہے۔ اہل نظر میں مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا وحید الدین خان، مجیب الرحمان شامی، شورش کاشمیری ،عبدالقادر حسن جیسے اہم لوگوں کیخاکے شامل ہیں۔اپنے اساتذہ

CamScanner

میں انہوں نے پروفیسر زکریا ساجد، پروفیسر ارشاد حسین نقوی اور سید متین الرحمٰن مرتضیٰ کو یاد کیا ہے ان اساتذہ کے خاکے غم خوار کے زیرعنوان کتاب کا حصّہ ہیں۔ ان اساتذہ کے خاکے انسانی کردار کی عمدہ مثالیں پیش کرتے ہیں۔ آج ہم جس کرداری بحران کا شکار ہیں اس میں ان اساتذہ کے کردار کو اجاگر کرنا بہت معنی خیز ہے۔ آج معاشرہ جس شکست وریخت کا شکار ہے اس میں اساتذہ ایک کلیدی کردار ادا کرسکتے ہیں اگر کا اپنا کردار اس معیار کا ہو جو ہمارے اسلاف کا تھا۔ ڈاکٹر فاروق عادل نے اس بات کا برملا اظہار کیا ہے کہ والد کے انتقال کے بعد اساتذہ نے میرا اعتماد بحال کیا، انہوں نے اس حوالے ایک واقعہ لکھا ہے کہ میری سائیکل بہت پرانی تھی، میرے استاد پروفیسر سید ارشاد حسین نقوی نے باقاعدہ سودا طے کرکے مجھے اپنی اچھی حالت کی سائیکل کا مالک بنا دیا تو میرا اعتماد پورے قدموں پر بحال ہو گیا۔ یہ بظاہر معمولی واقعہ ہے لیکن مشکل وقت میں ایسی ڈھارس انسان کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہوتی۔ ایک استاد کے بظاہر ایک معمولی سے عمل نے مستقبل کے ایک معمار کو مایوسی سے بچا کر معاشرے کا ایک اہم کردار بنا دیا۔ شعرا، ادیبوں اور اہل فن کے لیے میں جاگتا ہوں تیرا خواب دیکھنے کے لیے جیسا اچھوتا عنوان قائم کیا گیا ہے۔ اس میں امجد اسلام امجد، سراج منیر، ڈاکٹر خلیل طوقار، حمید شاہد، ڈاکٹر زاہد منیر عامر، جلال صوئیدان، آصف فرخی جیسی نابغہ روزگار شخصیات شامل ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کا کردار مثالی رہا ہے۔

خلیل طوقار اور جلال صوئیدان کا تعلق ترکی سے ہے ان کی اردو سے محبت قابلِ رشک ہے اور ہم جیسوں کو بہت کچھ سوچنے کی دعوت دیتی ہے۔ دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات میں دو خاکے شامل ہیں جس میں ایک خاکہ شریف برادران کی والدہ کا اور دوسرا مصنف کے والد صاحب کا ہے۔ ڈاکٹر فاروق عادل کے والد اپنے وقت کے معروف حکیم تھے اور اس فن کو اپنے بہت سارے شاگردوں تک پہنچایا۔ اس خاکے میں ان والد کے مثالی کردار کے نقوش اجاگر ہونے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر فاروق عادل کی بچپن کی بہت ساری یادیں بھی سمٹ آئی ہیں۔ ایک فرماں بردار بیٹے کا کردار بھی اس خاکے سے ابھرتا ہے۔ یہ اس کتاب کا آخری اور طویل ترین خاکہ ہے جو زندگی کی کئی تلخ و شیریں یادوں سے ترتیب پاتا ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے والد کی خدمات، عادات واطوار کا پتہ چلتا ہے بل کہ یہ اس عہد کی تہذیب و معاشرت کا بھی بہترین عکاس ہے۔ ڈاکٹر فاروق عادل کے خاکے محض خاکے نہیں ہیں بلکہ وہ ماضی و حال کے اہم کرداروں کی ایک کہکشاں ہے جس کے رنگوں کی دل آویزی قاری کو ہمہ وقت اپنے سحر میں رکھتی ہے۔ انہوں نے شخصیات کے کردار کو ان کے پورے سیاسی وسماجی پس منظر کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ مثلاً بیگم نسیم ولی خان کے خاکے سے اس وقت کے پورے سیاسی منظر نامے سے آگاہی ہوتی ہے۔ حیات محمد خان شیر پاؤ کے قتل کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سیاسی صورتحال اور اس کے بدن سے پھوٹنے والے غیرمعمولی حالات وواقعات کو بھی پوری صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے، یوں ایک پختون عورت کے سیاست میں وارد ہونے اور سیاسی نظام میں اہم کردار کے حوالے سے مکمل آگاہی ہوتی ہے۔ ان خاکوں میں اس طرح کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک عام قاری کے لیے اس میں معلومات وانکشافات کا بھی بڑا ذخیرہ ہے مثلاً نوری نستعلیق کے حوالے سے جمیل مرزا کا نام تو لیا جاتا ہے لیکن اس میں ایک اہم نام خطاط رشید شاہد کا تھا جس سے کم ہی لوگ آگاہ ہوں گے۔ ڈاکٹر فاروق عادل کو خاکہ نگاری پہ جو مہارت حاصل ہے وہ قابلِ رشک ہے۔ انہوں نے اپنے مطالعے اور مشاہدے کو بھرپور طور پر کام میں لایا ہے۔ شخصیات کی ایسی خوب صورت تصویر کشی کی ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ ان کے بعض جملے پورے پورے خاکوں پر بھاری ہیں۔ اے حمزہ کے کردار کو اجاگر کرنے کے بعد جب وہ لکھتے ہیں کہ وہ ہماری سیاست کے مرد درویش تھے انہیں صدر مملکت منتخب کیا جاتا تو اس منصب کی عزت میں اضافہ ہوتا۔ سینئر تاج حیدر کے خاکے سے سندھ میں پیپلز پارٹی کی پوری تفصیل سامنے آتی ہے۔ تاج حیدر کی طرح دیگر سیاست دانوں کے خاکے بھی اسی نوعیت کے ہیں جن سے قاری اس عہد کی سیاست کے کئی اہم گوشوں سے آگاہ ہوتا ہے۔ یہ محض خاکوں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ زندگی کے اتار چڑھاؤ اور اس کے نشیب وفراز کی داستان بھی ہے۔ یہ سیاست وصحافت سے جڑے ہوئے بہت سارے حالات و واقعات، محبتوں، نفرتوں، حسد اور رقابت کی مکمل دستاویز ہے۔

ڈاکٹر فاروق عادل بعض اوقات محض ایک جملے میں اپنے ممدوح کا پورا خاکہ بھی لکھ جاتے ہیں، ذرا سا غور کریں تو ان کے ممدوح کی پوری شخصیت کا پیکر سامنے آجاتا ہے۔ حافظ سلمان بٹ مولانا وحید الدین خان کے بارے میں درج ذیل جملے ملاحظہ فرمائیں۔ حافظ سلیمان بٹ کے خاکے میں وہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں فٹبال کے دامن میں انہوں نے یوں ہی پناہ نہیں لے رکھی تھی فٹبال ان کے لیے کسی صوفی کے غار جیسا تھا جس میں چھپ کر وہ علائق دنیا سے بچنے کے جتن کیا کرتے تھے۔ مولانا وحیدالدین کے خاکے میں لکھتے ہیں سچ جانیے تو وحیدالدین خان ہمارے عہد کے شہزاد تھے جنہوں نے آسمان کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے ہمارے بلند قامت بزرگوں کی موجودگی میں لکھنے کی الگ راہ نکالی اور دیکھتے ہی

دیکھتے چھا گئے۔ فاروق عادل کو زبان پر بھی کمال کی دسترس حاصل ہے ان کی ساری عمر تو صحافت کی وادی پرخار میں گزری لیکن ان کی نثر پڑھ کر لگتا ہے کہ جس طرح شاعر سہل ممتنع میں شعر کہتے ہیں فاروق عادل اسی طرح سہل ممتنع کی نثر لکھتے ہیں۔ ان کے بعض جملے تو قاری کو ٹھہر کر گہرے غور وخوض کی دعوت دیتے ہیں، چند جملے ملاحظہ ہوں۔ تعریف انسان کی انا کو گنے کا رس پلا کر اس کی روح کو راضی کر لیتی ہے۔، ان دنوں ہم جامعہ کراچی کے ہاسٹل ایوان اقبال میں رہتے تھے جامعہ کراچی کے اس ہاسٹل کی عمارتیں ابھی نئی اور سبزہ خال خال تھا بحیرہ عرب سے اٹھنے والی منہ زور ہوائیں جب پندرہ سولہ میل کا فاصلہ طے کر کے ہاسٹل کی چار منزلہ عمارت کی سیڑھیوں اور برآمدوں میں سے گزرتی تو طویل سروں کی تیز اور منہ زور سیٹیاں بجتیں ہارر فلموں کے صوتی اثرات کی شدت بھی ان سے کچھ کم ہی رہی ہوگی۔ پاکستان میں کبھی پیتل کے برتن ہوا کرتے تھے سونے کی طرح چمکتے اور لشکارے مارتے ہوئے لیکن اب نہیں ہوتے، ان کی جگہ ڈھیلا ڈالا پلاسٹک لے چکا ہے، مایوسی میں ڈوبے دلوں کی طرح جس کے رنگوں میں کوئی روشنی نہیں ہوتی۔ یہ چند جملے بطور مثال لکھے گئے ہیں ان کے ہاں ایسے جملے قدم قدم پر قاری کی توجہ کھینچتے ہیں۔ خاکہ کے حوالے سے خیال کیا جاتا ہے کہ یہ خاکہ نگار کے ذاتی مشاہدے کا حاصل ہوتا ہے، جس شخص سے خاکہ نگار کے ذاتی مراسم رہے ہوں، لیکن ڈاکٹر فاروق عادل کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے بعض خاکے محض اپنے مطالعے کی بنیاد پر لکھے ہیں جو خاکہ نگاری کی صنف کو مجروع نہیں کرتے۔ ان میں ہندو انتہا پسند بال ٹھاکرے اور بنگلہ دیش کی سابق وزیر اعظم حسینہ واجد کی مثال دی جا سکتی ہے۔

آپ ڈاکٹر فاروق عادل کے بعض نظریات سے اختلاف ضرور کر سکتے ہیں لیکن جس تہذیب کو پروان چڑھانے کی غرض سے انہوں نے خاکے لکھے ہیں جن شخصیات کو انہوں نے موضوع بنایا ہے ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ پہ اہم ہے اور بعض شخصیات کی ایسی مونی تصاویر کھینچی ہیں کہ ان پہ پیار آتا ہے۔ ان میں سے ہر شخصیت کے خاکے کا علیحدہ علیحدہ تجزیہ بھی کیا جا سکتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی اگر فاروق عادل نے ان شخصیات کی زندگی کی تصویر کشی اپنی تہذیب اور اپنی تربیت کے مطابق کی ہے۔ انہوں نے ایوان صدر کی بھول بھلیوں میں بھی برس گزارے ہیں اس لیے وہ بہت سارے واقعات اور گوناگوں حالات کے چشم دید گواہ بھی ہیں اس لیے ان کے قلم کا معتبر ہونا بھی ٹھہرتا ہے۔ فاروق عادل نے ہمارے عہد کی جیتی جاگتی شخصیات کو ہمارے سامنے اس طرح پیش کیا ہے کہ ہمیں ان کی شخصیات کے حوالے سے نہ صرف گراں قدر معلومات ملتی ہیں بلکہ ان کی شخصیات کی کئی پرتیں ہمارے سامنے وا ہوتی ہیں ڈاکٹر فاروق عدل نے بعض ایسی شخصیات کے خاکے بھی لکھے ہیں جن سے وہ شاید ملے بھی نہیں ان میں بھارتی ہندو انتہا پسند تنظیم کے سربراہ بال ٹھاکرے اور بنگلہ دیش کی سابق وزیر اعظم حسینہ واجد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مجھ نا چیز کی ایک خوش بختی یہ بھی ہے کہ اس کتاب میں جن شخصیات کا تذکرہ ہوا ہے ان میں سے کئی ایک سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا ہے اور انہیں دیکھنے اور سننے کا موقع ملا ہے یوں بہت ساری یادیں تازہ ہوگئی ہیں بالخصوص شہر قائد میں گزری ایام کی خوب یادیں تازہ ہوئی ہیں۔

❁❁❁

شکوہ بے گھری تمام کرے
آئے دل میں ابھی قیام کرے
آنے والے ہیں دن مصیبت کے
رزقِ گریہ کا اہتمام کرے
آنکھیں ٹکرا رہی ہیں آنکھوں سے
اب تو بولے وہ کچھ کلام کرے
پہلے آنکھوں کا دبدبہ دیکھے
اور پھر تیغ بے نیام کرے
بادشاہت سے کب کسے فرصت
حکمرانی کوئی غلام کرے
بے یقینی سی خود پہ ہونے لگے
کوئی ایسے نہ احترام کرے

اسد رضا سحر

اپنے خوابوں میں رنگ بھرتی ہوئی
جا رہی ہوں میں اب سنورتی ہوئی
اپنی انگلی کو تھامے صحرا سے
کبھی گزری تھی میں بھی ڈرتی ہوئی
ہاتھ اپنے کہاں چھپاؤ گے
رنگ چھوڑے گی تتلی مرتی ہوئی
روح میں چھید کر گئی جیسے
یاد آنسو کے ساتھ اُبھرتی ہوئی
جب کسی کا ہو انتظار ثبات
شام آتی ہے رقص کرتی ہوئی
غم کے ہمراہ جا رہی ہوں ثبات
ہاتھ پہ ہاتھ میں بھی دھرتی ہوئی

کشور ثبات

عامر بن علی: دھنک رنگ تخلیق کار

عدنان آصف بھٹہ/میاں چنوں

دنیائے شعروادب میں بعض نام ایسے ہوتے ہیں جو محض شاعر یا نثر نگار نہیں رہتے بلکہ رفتہ رفتہ ایک تہذیبی احساس میں ڈھل جاتے ہیں۔ ادب کی دنیا میں ایسے اہلِ قلم کم پیدا ہوتے ہیں جن کی شخصیت کئی جہات میں یکساں درخشاں ہو۔ عامر بن علی انہی نابغہ روزگار ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں جن کی شاعری، نثر، سفرنامے اور تراجم سب مل کر ایک ایسی ادبی فضا تشکیل دیتے ہیں جس میں تہذیب، نفاست، محبت اور فکری وقار کی خوشبو رچی بسی محسوس ہوتی ہے۔ وہ محض الفاظ کے کاریگر نہیں بلکہ احساس کے معمار ہیں۔

عامر بن علی کی شخصیت کا سب سے اہم اور دلکش پہلو ان کا ادبی انکسار ہے۔ وہ ان لوگوں میں شامل نہیں جو ادب کو خودنمائی کا اسٹیج بنا لیتے ہیں۔ ان کے مزاج میں ایک خاموش وقار ہے۔ ان کی تحریروں میں چیخ کم اور سرگوشی زیادہ ملتی ہے، مگر یہی سرگوشی دیر تک قاری کے دل و دماغ میں گونجتی رہتی ہے۔ وہ قاری کو مرعوب نہیں کرتے بلکہ اس کے اندر چھپی ہوئی حساسیت کو بیدار کرتے ہیں۔ آج جب ادب کا ایک بڑا حصہ فوری شہرت، سوشل میڈیا کی مقبولیت اور سطحی جذباتیت کے گرد گھومتا دکھائی دیتا ہے، وہاں عامر بن علی کی تحریریں ایک خوشگوار استثنا محسوس ہوتی ہیں۔ ان کے ہاں ادب اب بھی ایک سنجیدہ جمالیاتی اور انسانی سرگرمی ہے۔ وہ لفظ کو محض اظہار نہیں سمجھتے بلکہ اسے تہذیب، شعور اور احساس کی امانت تصور کرتے ہیں۔

عامر بن علی کی شاعری میں محبت ایک مرکزی استعارے کی حیثیت رکھتی ہے، مگر یہ محبت سطحی رومان یا جذباتی ہیجان کی صورت میں سامنے نہیں آتی۔ ان کے ہاں محبت ایک تہذیبی تجربہ ہے، ایک کیفیت ہے، ایک ایسا داخلی سفر ہے جس میں انسان اپنے آپ سے آشنا ہوتا ہے۔ ان کے اشعار میں محبوب صرف ایک فرد نہیں رہتا بلکہ کبھی یاد کی دھند بن جاتا ہے، کبھی وقت کے ماتھے پر رکھی ہوئی نرم ہتھیلی، اور کبھی انسان کے اندر بچ جانے والی آخری روشنی۔ ان کے شعری اسلوب میں ایک اطمینان بھری شائستگی پائی جاتی ہے۔ وہ جذبات کو اچھال کر پیش نہیں کرتے بلکہ انہیں تہذیب کے دبیز پردوں میں لپیٹ کر بیان کرتے ہیں۔ ان کے یہاں لفظوں کا انتخاب اس قدر محتاط اور نفیس ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ شعر نہیں لکھ رہے بلکہ کسی نازک شیشے پر خاموشی سے نقش بنا رہے ہوں۔

ان کی شاعری میں مصنوعی پیچیدگی نہیں، مگر سادگی بھی ایسی نہیں جو سطحی پن کا شکار ہو جائے۔ وہ سہلِ ممتنع کی اس روایت سے جڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جہاں شعر پہلی قرأت میں دل کو چھو لیتا ہے اور دوسری قرأت میں ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ عامر بن علی کی شاعری کا ایک اہم وصف ٹھہراو بھی ہے۔ یہ وصف دراصل انکی ذات سے پھوٹتا ہے آج کے عہد میں جہاں اکثر تحریریں فوری ردِعمل، شور اور جذباتی اشتعال سے بھری ہوئی دکھائی دیتی ہیں، وہاں ان کی شاعری ایک خاموش دریا کی مانند محسوس ہوتی ہے۔ ان کے ہاں دکھ بھی مہذب ہے، محبت بھی مہذب ہے، حتیٰ کہ احتجاج بھی تہذیب کے دائرے میں رہ کر جنم لیتا ہے۔ وہ قاری پر اپنے خیالات مسلط نہیں کرتے بلکہ اس کے احساس کو آہستگی سے بیدار کرتے ہیں۔ یہی رویہ بڑے ادیبوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ کالم نگاری قدرے ایک مشکل اور مستقل مزاجی کا کام ہے، جس میں مسلسل، بلا تکان لکھنا پڑتا ہے عامر بن علی یہ مشکل کام برسوں سے کرتے آرہے ہیں اگرچہ ان کے کالموں میں سیاحت کا رنگ نمایاں ہے لیکن وہ ان میں معاشی، معاشرتی اور ٹیکنالوجیکل پہلوؤں پہ زیرک نظری سے کام لیتے ہوئے اپنے قارئین کی تربیت کرتے نظر آتے ہیں

ان کی نثر میں نفاست، داخلی وقار اور فکری لطافت دکھائی دیتی ہے۔ عامر بن علی ان نثر نگاروں میں سے ہیں جو منظر نگاری صرف آنکھ سے نہیں کرتے بلکہ روح سے کرتے ہیں۔ ان کے سفرنامے محض شہروں، راستوں اور تاریخی مقامات کی تفصیل نہیں ہوتے بلکہ تہذیبوں کے باطن کا مطالعہ بن جاتے ہیں۔ وہ کسی شہر کی گلیوں میں چلتے ہوئے صرف عمارتیں نہیں دیکھتے بلکہ وہاں کے لوگوں کی خاموشیاں، ان کے چہروں کی تھکن، ان کی آنکھوں میں چھپی ہوئی امیدیں اور تاریخ کی شکستہ آوازیں بھی سن لیتے ہیں۔ ان کے سفرناموں کا مطالعہ کرتے ہوئے بارہا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک سیاح سے زیادہ ایک حساس مبصر اور داخلی فلسفی ہیں۔ وہ منظر کو بیان کرنے سے پہلے اس کے باطن میں اترتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں خارجی دنیا کے ساتھ ساتھ انسان کا اندرونی جہان بھی روشن ہو اٹھتا ہے۔ ان کے سفرنامے قاری کو صرف دنیا دکھاتے نہیں بلکہ اسے خود اس کے اپنے باطن سے بھی ملواتے ہیں۔ بطور مترجم عامر بن علی کی ادبی خدمات خصوصی توجہ کی مستحق ہیں۔ ترجمہ بظاہر ایک زبان سے دوسری زبان میں الفاظ منتقل کرنے کا عمل لگتا ہے، مگر حقیقت

CamScanner

میں یہ دو تہذیبوں، اور دو احساساتی نظاموں کے درمیان ایک نہایت نازک مکالمہ ہوتا ہے۔ اس مکالمے میں ذرا سی بے احتیاطی اصل تخلیق کی روح کو زخمی کرسکتی ہے۔ عامر بن علی نے اس ذمہ داری کو نہایت سنجیدگی اور فنی دیانت داری سے نبھایا ہے۔ خصوصاً انہوں نے Gabriel Mistral اور Pablo Neruda کی منتخب نظموں کا براہِ راست ہسپانوی زبان سے اردو میں ترجمہ کر کے ایک اہم ادبی کارنامہ انجام دیا ہے۔ گبریلا مسٹرال اور نیرودا دونوں کا تعلق چلی سے ہے اور دونوں ہی عظیم شاعر ہیں دونوں کو نوبیل پرائز دیا گیا۔ یہ دونوں شاعر نہیں بلکہ بیسویں صدی کے ان معدودے چند تخلیق کاروں میں سے ہیں جنہوں نے محبت، انقلاب، تنہائی اور انسانی دکھ کو عالمی شعور کا حصہ بنا دیا۔ ان دونوں کے سیاسی نظریات میں بُعدُ المشرقین ہونے کے باوجود انکی زندگیوں اور شاعری میں بہت سی قدریں مشترک ہیں ان کی شاعری میں سمندر کی وسعت بھی ہے، جلاوطنی کی اداسی بھی، عشق کی تپش بھی اور محکوم انسان کے لیے ایک بے چین دل بھی۔

ایسی شاعری کو اردو میں منتقل کرنا محض لسانی مہارت کا کام نہیں بلکہ اس کے فکری اور جذباتی کائنات میں داخل ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ عامر بن علی نے گبریلا مسٹرال اور نیرودا کے ترجمے میں صرف مفہوم کی منتقلی پر اِکتفا نہیں کیا بلکہ اصل شاعری کی روح، اس کی موسیقیت، اس کی اداسی اور اس کی داخلی آگ کو بھی اردو کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو پڑھتے ہوئے ترجمہ ہونے کا احساس کم اور ایک نئی تخلیق کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ یہ کام ایک شاعر ہی احسن طریقے سے کر سکتا ہے۔ گبریلا مسٹرال کی نظمیں گنجلدار نہیں لیکن گہری ہیں ترجمہ کرتے ہوئے عامر بن علی نے اس بات کا خیال رکھا ہے مشکل لفاظی سے اپنی علمیت جھاڑنے کی بجائے سادہ مگر موثر پیرائے کا انتخاب کیا ہے، بالخصوص نظموں کے عنوانات بھاری بھرکم تراکیب کی بجائے بہت ہی سلیقے اور سادگی سے منتخب کیے ہیں، مثلاً لجا، تفتیش، مردے کی ہڈیاں، روشنی، ہوا، پانی، اشعار، ننھے پاوں، چوٹی۔۔۔ ایک جگہ وہ lucky Light کا ترجمہ "بھاگ بھری روشنی" سے کرتے ہیں اگر یہ کام کوئی میکانیکی مترجم کرتا تو وہ شاید خوش قسمت روشنی کرتا لیکن ایک شاعر ہی اس کو بھاگ بھری روشنی کر سکتا ہے اس طرح کی بے شمار مثالیں اس ترجمہ میں موجود ہیں۔

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ انہوں نے گبریل مسٹرال اور نیرودا کو نہ صرف براہِ راست ہسپانوی زبان سے اردو میں منتقل کیا۔ بلکہ وہ اس تہذیب و تمدن کو اپنے اندر سمونے کے لیے خود ان عظیم شعرا کے دیس چلی میں مقیم رہے ہیں تاکہ زبان کے ساتھ ساتھ ان احساسات کا تجربہ بھی کیا جاسکے جو وہ شاعر وہاں رہ کر کرتے تھے۔ اردو میں اکثر عالمی ادب، انگریزی کے واسطے سے آتا ہے، جس سے اصل متن کی کئی باریکیاں راستے میں گم ہو جاتی ہیں۔ مگر براہِ راست ترجمہ ایک طرح کی ادبی امانت داری ہے، اور عامر بن علی نے اس امانت کا بھار نہایت خوبصورتی سے اٹھایا ہے۔ اس عمل نے اردو قاری کو ان عظیم شاعروں کے اصل لہجے سے قریب تر کر دیا ہے۔ اور ترجمے کو محض فنی مشق کے بجائے ایک تہذیبی مکالمہ بنا دیا ہے۔

✧✧✧

✿

ہو شوخ کلر گورا بدن تیکھا لبادہ
اپنی تو طلب ایک ہے پیشانی کشادہ

اس شہر میں کیا کرنا ہے عشاق نے رہ کر
اس شہر میں ساغر ہے نہ مینا ہے نہ بادہ

حرف آنے کسی طور نہیں دیتی وطن پر
غیرت کا اگر قوم میں موجود ہو مادہ

فرصت ہو میسر تو کبھی سوچنا اس پر
کیوں ملک چلا ہاتھ سے تیرے گیا آدھا

جینا ہے تو جینا ہے فقط تیرے سہارے
اپنی میں بتاؤں تو یہی ایک ارادہ

چاہوں بھی تو میں شکر ادا کر نہیں پاؤں
انعام ترے مجھ پہ ہیں کچھ اتنی زیادہ

پاؤں تو سلامت ہیں اگر جوتے نہیں تو
شاکر ہوں خدایا میں ترا پیر پیادہ

ہر چال زمانے کی سمجھتا ہے بخاری
سادہ ہے مگر اتنا بھی عاصم نہیں سادہ

عاصم بخاری میانوالی

مصنف اور قاری کے درمیان بولتا ہوا رشتہ

لبنیٰ صفدر / لاہور

ادب انسانی تہذیب کی ان نایاب اور گہری تخلیقی سرگرمیوں میں سے ایک ہے جو محض زبان یا لفظوں کی ترتیب نہیں بلکہ انسانی شعور کے اندر چھپے ہوئے تجربات احساسات اور فکری دھاروں کو ایک نئی صورت میں ظاہر کرتی ہے۔ جب انسان نے پہلی بار اپنے اندر کے احساس کو باہر بیان کرنے کی کوشش کی تو وہ محض اظہار نہیں تھا بلکہ ایک ایسے تعلق کی بنیاد تھی جو آنے والی تمام انسانی تہذیبوں کے فکری ڈھانچے کا حصہ بن گیا۔ یہی وہ تعلق ہے جسے ہم مصنف اور قاری کے رشتے کے نام سے پہچانتے ہیں۔

یہ رشتہ بظاہر بہت سادہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص لکھتا ہے اور دوسرا پڑھتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ انسانی شعور کی دو مختلف سطحوں کے درمیان ایک مسلسل مکالمہ ہے۔ مصنف اپنے اندر کے تجربے کو لفظوں میں ڈھالتا ہے، مگر وہ لفظ اپنی مکمل معنویت اس وقت حاصل کرتے ہیں جب وہ کسی دوسرے ذہن یعنی قاری کے شعور میں داخل ہوتے ہیں۔ قاری ان لفظوں کو اپنے تجربے اپنی یادداشت اور اپنی فکری ساخت کے مطابق دوبارہ تشکیل دیتا ہے۔ اس طرح ادب ایک بند اور محدود عمل نہیں رہتا بلکہ ایک کھلا جاری اور زندہ تخلیقی سفر بن جاتا ہے۔

یہ رشتہ انسانی تاریخ کے ہر دور میں ایک جیسا نہیں رہا۔ وقت، تہذیب، معاشرتی ڈھانچے، فکری نظام اور ٹیکنالوجی کی تبدیلی نے اس تعلق کو ہر دور میں نئی شکل دی ہے۔ کبھی مصنف کو مرکزیت حاصل رہی، کبھی قاری کو، اور کبھی دونوں ایک دوسرے کے برابر کھڑے دکھائی دیے۔ ادب کی تاریخ دراصل اسی بدلتے ہوئے توازن کی تاریخ ہے۔

قدیم انسانی معاشروں میں ادب بنیادی طور پر زبانی روایت کا حصہ تھا۔ اس زمانے میں تحریر کا وجود محدود یا غیر مؤثر تھا اور انسانی علم، تاریخ، قصے، کہانیاں، شعری اظہار اور فکری ورثہ سب کچھ زبان کے ذریعے ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا تھا۔ شاعر، قصہ گو یا حکایت بیان کرنے والا شخص براہ راست اپنے سامعین کے سامنے موجود ہوتا تھا۔ یہ صرف تفریح کی محفل نہیں ہوتی تھی بلکہ اجتماعی شعور کی تشکیل کا بنیادی ذریعہ ہوتی تھی۔

اس دور میں مصنف اور قاری کا کوئی واضح تصور موجود نہیں تھا۔ دراصل سامعین اور بیان کرنے والے کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں تھا۔ ادب ایک اجتماعی تجربہ تھا جو فوراً وقوع پذیر ہوتا تھا۔ اگر کوئی قصہ سنایا جاتا تو سامعین فوراً اپنی پسند یا ناپسند کا اظہار کرتے۔ اگر شعر دل کو چھو لیتا تو داد دی جاتی اور اگر اثر نہ کرتا تو خاموشی چھا جاتی۔ اس طرح تخلیق اور ردعمل ایک ہی لمحے میں مکمل ہو جاتا تھا۔ ادب ایک زندہ، متحرک اور اجتماعی تجربہ تھا جس میں فرد کی نسبت اجتماع کی آواز زیادہ نمایاں تھی۔

اس دور میں ادب کا مقصد صرف جمالیاتی نہیں تھا بلکہ عملی بھی تھا۔ یہ تاریخ کو محفوظ رکھتا تھا، اخلاقی اقدار کو منتقل کرتا تھا، اور اجتماعی شناخت کو قائم رکھتا تھا۔ قبیلوں اور معاشروں کی یادداشت زبانی ادب کے ذریعے زندہ رہتی تھی۔

لیکن انسانی تہذیب نے جب تحریر کو دریافت کیا تو ایک عظیم فکری انقلاب شروع ہوا۔ تحریر نے ادب کو وقت اور جگہ کی قید سے آزاد کر دیا۔ اب مصنف ایک وقت میں لکھتا ہے لیکن قاری کسی اور وقت اور کسی اور جگہ پر اسے پڑھتا ہے۔ یہ فاصلہ بظاہر ایک دوری پیدا کرتا ہے لیکن حقیقت میں یہ ادب کو دوام بخشتا ہے۔

تحریر نے مصنف کی آواز کو وقت کے سمندر میں محفوظ کر دیا۔ اب ایک انسان اپنے زمانے سے آگے دیکھ سکتا ہے۔ اس کی فکر آنے والی نسلوں تک پہنچ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آج بھی صدیوں پرانی کتابوں سے مکالمہ کرتے ہیں۔ تحریر نے مصنف کو وقتی موجودگی سے نکال کر دائمی موجودگی عطا کی۔

کلاسیکی دور میں مصنف کو غیر معمولی حیثیت حاصل تھی۔ اسے علم و حکمت اور فکری رہنمائی کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ قاری اکثر مصنف کے خیالات کو حتمی سچائی کے طور پر قبول کرتا تھا۔ ادب کا مقصد صرف خوبصورتی نہیں بلکہ اصلاح، اخلاقی تربیت اور فکری رہنمائی بھی تھا۔

اردو ادب کی روایت میں سرسید احمد خان نے ادب کو سماجی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ ان کے نزدیک ادب کا مقصد معاشرے کو جدید فکر سے روشناس کرانا تھا۔ ان کے لیے قاری ایک ایسا فرد تھا جسے تعلیم اور عقل کے ذریعے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

علامہ اقبال کے ہاں قاری ایک ساکن وجود نہیں بلکہ ایک متحرک باشعور اور خودی رکھنے والا انسان ہے۔ ان کا ادب قاری کو جھنجھوڑتا ہے، اسے سوال کرنے پر مجبور کرتا ہے اور اسے اپنی داخلی قوت دریافت کرنے کی طرف لے جاتا ہے۔

حالی اور شبلی کے ہاں ادب اخلاقی اور فکری تربیت کا ذریعہ ہے۔ ان کے مطابق مصنف ایک معلم ہے اور قاری ایک طالب علم۔

لیکن جدید دور میں یہ تصور بدلنے لگا۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں انسان کو مرکزیت حاصل ہوئی اور فرد کی داخلی دنیا کو اہمیت دی جانے لگی۔ ادب اب صرف پیغام رسانی نہیں رہا بلکہ انسانی شعور کی پیچیدگیوں کا اظہار بن گیا۔

یہاں سے قاری کا کردار بدلنا شروع ہوا۔ وہ اب صرف وصول کرنے والا نہیں رہا بلکہ معنی پیدا کرنے والا بن گیا۔ متن اب ایک بند شے نہیں بلکہ ایک کھلا میدان بن گیا جہاں مختلف معانی پیدا ہو سکتے ہیں۔

بیسویں صدی میں قاری اساس تنقید نے اس تبدیلی کو نظریاتی بنیاد فراہم کی۔ رولان بارت کے مطابق متن کا کوئی ایک حتمی معنی نہیں ہوتا بلکہ ہر قاری اپنے تجربے کے مطابق معنی پیدا کرتا ہے۔ وولف گانگ آئزر کے مطابق متن میں کچھ خلا ہوتے ہیں جنہیں قاری اپنے ذہن سے پر کرتا ہے۔ اسٹینلے فش کے مطابق معنی قاری کی سماجی اور فکری برادریوں سے جنم لیتے ہیں۔

یہ نظریات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ ادب کوئی مکمل شے نہیں بلکہ ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے جو ہر قرأت کے ساتھ نئے معنی پیدا کرتا ہے۔

اردو ادب میں بھی قاری کا کردار بدلتا رہا ہے۔ کلاسیکی دور میں ادب احترام سے پڑھا جاتا تھا۔ جدید دور میں اس پر سوال اٹھایا جانے لگا۔ ترقی پسند تحریک نے قاری کو سماجی شعور دیا۔ جدیدیت نے اسے علامتوں ابہام اور داخلی تجربات کی دنیا میں داخل کیا۔

آج کا قاری زیادہ باشعور زیادہ تنقیدی اور زیادہ متجسس ہے۔ وہ ہر متن کو پرکھتا ہے اور اس کے معنی پر سوال کرتا ہے۔

ڈیجیٹل دور نے اس تعلق کو مکمل طور پر بدل دیا ہے۔ اب ادب کتاب تک محدود نہیں رہا بلکہ اسکرین، موبائل، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا پر پھیل چکا ہے۔ قاری فوری ردعمل دیتا ہے۔ لائکس، کمنٹس اور شیئرز نے ادب کو فوری ردعمل کا عمل بنا دیا ہے۔

سوشل میڈیا نے قاری کو غیر معمولی طاقت دے دی ہے۔ اب ہر قاری ایک ممکنہ مصنف ہے۔ وہ لکھ سکتا ہے۔ شائع کر سکتا ہے اور فوری ردعمل حاصل کر سکتا ہے۔ اس تبدیلی نے ادب کو جمہوری ضرور بنایا ہے لیکن اس کے ساتھ سطحیت کا خطرہ بھی پیدا کیا ہے۔

اب ایک بڑا سوال یہ ہے کہ کیا مصنف کو قاری کی پسند کے مطابق لکھنا چاہیے یا اپنی تخلیقی آزادی کو برقرار رکھنا چاہیے۔ اگر مصنف صرف مقبولیت کے لیے لکھے تو ادب اپنی گہرائی کھو دیتا ہے اور اگر قاری کو مکمل نظرانداز کرے تو وہ غیر متعلق ہو سکتا ہے۔

یہی توازن ادب کی اصل آزمائش ہے۔

آج کے دور میں مصنوعی ذہانت نے اس بحث کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے۔ اب مشینیں بھی متن تخلیق کر رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسی تحریر میں وہ انسانی احساس موجود ہو سکتا ہے جو ادب کی اصل روح ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ادب صرف معلومات نہیں بلکہ انسانی احساس کا اظہار ہے۔ اور احساس ہمیشہ انسانی ہوتا ہے۔

قاری دراصل صرف پڑھنے والا نہیں بلکہ ایک داخلی تخلیق کار ہے۔ وہ ہر متن کو اپنے تجربے سے دوبارہ تخلیق کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی متن مختلف افراد کے لیے مختلف معنی رکھتا ہے۔

ادب کا حسن اسی میں ہے کہ یہ دو اجنبی انسانوں کو ایک فکری اور جذباتی رشتے میں جوڑ دیتا ہے۔ ایک انسان اپنی تنہائی کو لفظ دیتا ہے اور دوسرا انسان اس تنہائی میں اپنی زندگی کا عکس دیکھتا ہے۔

یہ رشتہ نہ کبھی مکمل طور پر مصنف کے اختیار میں رہا ہے اور نہ ہی قاری کے۔ یہ ہمیشہ ایک زندہ، متحرک اور بدلتا ہوا مکالمہ رہا ہے۔ اور یہی ادب کا اصل معجزہ ہے کہ یہ وقت، فاصلے اور زبان کی تمام حدوں کے باوجود انسان کو انسان سے جوڑتا رہتا ہے۔

دل کی آیات میں آ جاتا ہے
وہ مناجات میں آ جاتا ہے
منکشف ہوتا ہے مجھ میں پہلے
پھر کرامات میں آ جاتا ہے
پہلے تو روگ بنے دل کا اور پھر
ہجر ظلمات میں آ جاتا ہے
آنکھ روتی ہے مگر حد یہ ہے
اشک برسات میں آ جاتا ہے
ایک گلشن سا مہک اُٹھتا ہے
وہ خیالات میں آ جاتا ہے
کسی شہنائی کی دُھن میں چھپ کر
درد بارات میں آ جاتا ہے

اس کی آنکھوں سے عیاں ہونا ہے
پھر محبت کا بیاں ہونا ہے
نیند تھوڑی سی عطا ہو مجھ کو
میرے خوابوں کو جواں ہونا ہے
خود کو رکھنا ہے پسِ منظر میں
اک حقیقت نے گماں ہونا ہے
عمر گزرے گی تری آنکھوں میں
اب ٹھکانہ بھی کہاں ہونا ہے
شور کرنا ہے گھنے جنگل میں
اب ہواؤں کی زباں ہونا ہے
پہلے دریا میں اُترنا ہے مجھے
پھر سمندر میں رواں ہونا ہے

لبنیٰ صفدر/ لاہور

راحت سرحدی/راولپنڈی

پگھل نہ جائے مجھے ڈر ہے آتشِ غم سے
جو ایک ضبط کی زنجیر پائے آہ میں ہے

لفظ کلہاڑی بنے اور بات آری ہو گئی
مجھ سے کل بے ساختہ تخریب کاری ہو گئی
پہلے دل ٹوٹا کسی آئینہ خانے کی طرح
پھر مری پلکوں سے خوں کی نہر جاری ہو گئی
ہاتھ آخر آ گیا اپنے گریباں تک مرا
خود کلامی میں عجب وحشت سی طاری ہو گئی
اپنے گم ہونے کا خود اعلان کرنا پڑ گیا
آئنے سے شکل میری اشتہاری ہو گئی
خشک سالی سے لہکتا جسم بنجر ہو گیا
سنگ ان آنکھوں کی خوئے اشکباری ہو گئی
آسماں کو خاک کہتا ہے زمیں کو عرش نو
کیا تری راحت کسی پاگل سے یاری ہو گئی

دھوپ میں پوچھنے نہ آیا مجھے
زہر لگنے لگا ہے سایہ مجھے
رات اک دم دبوچ لے گی تمھیں
بھول کر بھی اگر بجھایا مجھے
کب سے فکرِ شکارِ عرش میں ہے
اُس نے کس خاک سے بنایا مجھے
فلسفے رہ گئے دھرے کے دھرے
وقت نے وہ سبق سکھایا مجھے
میری انگلی پکڑ کے گردش نے
کون سا در نہیں دکھایا مجھے
پھر کہاں اپنا آپ دیکھے گا
سامنے سے اگر ہٹایا مجھے
غم نے تصویر کی طرح راحت
گھر کی دیوار سے لگایا مجھے

اپنی چمڑی سے بنی پاپوش پہنائی اُسے
پھر نہ جانے کیا ہوا عزت نہ راس آئی اُسے

جا نہیں سکتا کوئی اِس گنبدِ بے سمت سے
خاک پر مارے گا شوقِ عرش پیمائی اسے
میری آنکھوں میں اُبلتے قلزمِ خوں رنگ کی
دور سے کیسے نظر آئے گی گہرائی اُسے
پوچھ کر تو آ کہ کیا کہتا ہے قیسِ خستہ دل
تاج سے بڑھ کر ہو شاید طوقِ رسوائی اُسے
کیا کرے گا دان میں آنکھیں کہ ان کے خواب بھی
ہو گئے زندہ اگر ملتے ہی بینائی اسے
آئنے کو دادِ تابِ حُسن ، ورنہ دیکھتا
راکھ کر دیتی کسی کی جلوہ آرائی اسے
یہ بتا راحت کہ تیرے پاس کیا رہ جائے گا
آخری تحفے میں دے کر اپنی تنہائی اُسے

لگے سراغ وہاں خاک ہاتھ اندر سے
کہ کی گئی ہو جہاں واردات اندر سے
بتا رہی تھی مجھے ساز باز مہروں کی
کہ جیت کر بھی یقینی ہے مات اندر سے
درِ افق پہ صدا دی جو ڈھلتے سورج نے
تو بال کھولے چلی آئی رات اندر سے
اُسے نقیبِ شبِ غم سمجھ چراغ نہ کہہ!
جو بک چکا ہو سیاہی کے ہاتھ اندر سے
بچھڑ کے گھر سے ترے لوٹتے ہوئے یوں لگا
کہ میرا سایہ نہیں آیا ساتھ اندر سے
یہ بند مٹھی کسی دن اگر کھلی راحت
تہی ملے گی کفِ کائنات اندر سے

وہ طمطراقِ سکندر نہ قصرِ شاہ میں ہے
جو بات راحتِ خستہ کی خانقاہ میں ہے
میں اُس سماج کو تسلیم کس طرح کر لوں
کہ عشق جیسی عبادت جہاں گناہ میں ہے
پگھل نہ جائے مجھے ڈر ہے آتشِ غم سے
جو ایک ضبط کی زنجیر پائے آہ میں ہے
اِسے ہٹانا پڑے گا جنوں کی ٹھوکر سے
یہ کائنات رکاوٹ مری نگاہ میں ہے
کہاں بنائے گا تو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد
تمام شہر تو شامل حدودِ شاہ میں ہے
کہ یہ بھی میری طرح بھولتی نہیں تجھ کو
اسی لئے تو نمی چشمِ سیر گاہ میں ہے
کہیں بھی جاؤں مجھے کھینچتی ہے اپنی طرف
کشش عجیب سی راحت کسی کی راہ میں ہے

دن کو پامال شدہ رات بنا دیتے ہیں
دُکھ عجب صورتِ حالات بنا دیتے ہیں
کچھ نہیں ہے تو ذرا دیر سہارے کے لئے
گرتی دیوار پہ اک ہاتھ بنا دیتے ہیں
چاند تارے یہ مہکتی ہوئی کلیاں یہ دیے
ہجر کو شامِ ملاقات بنا دیتے ہیں
عام لفظوں کو بھی چھو کر ترے جادوئی لب
اپنی خوشبو سے طلسمات بنا دیتے ہیں
کھینچ کر اک خطِ تنسیخ جہانِ رد پر
تم کہو تو نئے دن رات بنا دیتے ہیں
ایک جیسے ہیں سبھی لوگ تو پھر کون ہیں وہ
ان کے مابین جو طبقات بنا دیتے ہیں
ظلم کے شوقِ تجاوز کو بھی تاریخ نگار
موت کے ڈر سے مہمات بنا دیتے ہیں
دیکھ آ جائے کوئی ڈھونڈنے والا راحت
خوں سے رستے میں نشانات بنا دیتے ہیں

CamScanner

سجاد بلوچ/لاہور

بیٹھے ہیں اگلی نشستوں پہ تجھے دیکھنے کو
ورنہ ہم خالی کلاسوں میں بھی پیچھے بیٹھے

پڑ گئی شام جب اس راہ میں بیٹھے بیٹھے
موجۂ گرد نے پوچھا یہاں کیسے بیٹھے
ہر مسافر پہ ہمیں تیرا گماں ہوتا تھا
گرد کے ساتھ کئی بار ہیں اٹھے بیٹھے
ہم ہی تھے محفلِ یاراں ترے بنیاد گزار!
رہ گئے ہم ہی سرِ شام اکیلے بیٹھے
اسے معلوم تھا یہ شامِ جدائی ہے سو ہم
آخری بار بہت دیر اکٹھے بیٹھے
میں نے کیا کرنا ہے اس قیمتی گلدستے کو
دوست ہے وہ تو مصیبت میں سرہانے بیٹھے
تو گھنا پیڑ سہی پر مرے دشمن کا ہے
اب مرے جیسا ترے سائے میں کیسے بیٹھے
بیٹھے ہیں اگلی نشستوں پہ تجھے دیکھنے کو
ورنہ ہم خالی کلاسوں میں بھی پیچھے بیٹھے
کیا مکدر تھی فضا دل کی مگر اب دیکھو
چند بوندیں پڑیں اور کیسے بگولے بیٹھے

تھکن کے چڑھتے اترتے خمار تھک گیا میں
قرار، گردشِ لیل و نہار! تھک گیا میں
ہواؤ! آؤ اڑاؤ ذرا مری بھی خاک
اڑا اڑا کے یہ گرد و غبار تھک گیا میں
میں تنگ آیا گریبان چاک کر کر کے
کہ توڑ توڑ کے غم کا حصار، تھک گیا میں
نیا زمانہ، نئے ضابطے، نئے آداب
اٹھا اٹھا کے تکلف کا بار تھک گیا میں
نہ دن کو چین میسر نہ رات کو آرام
غمِ فراق و غمِ روزگار! تھک گیا میں
مجھے اب اپنی اکائی کی فکر لاحق ہے
کہ ہوتے ہوتے یہاں بے شمار تھک گیا میں

خوشی تو چھوڑیے غم تک یہاں دکھاوا ہے
سو دیکھ دیکھ کے یہ اشتہار تھک گیا میں
اگر کسی نے خریدا نہ آج بھی مرا دِن
تو معذرت، مرے لیل و نہار! تھک گیا میں
مرے چراغ! مرے ہم نشیں! خدا حافظ
مرے سکوت! مرے انتظار! تھک گیا میں

بھلا ہو آپ کا جو چاک دامانی سمجھتے ہیں
وگرنہ لوگ اس وحشت کو عریانی سمجھتے ہیں
ہماری صورتِ حالات ایسی ہے کہ اب جس دن
نئی مشکل نہیں پڑتی تو آسانی سمجھتے ہیں
تو اتنے آئنوں کے سامنے کیوں خوار ہوتا ہے
ہمیں مل، ہم تری آنکھوں کی حیرانی سمجھتے ہیں
نہیں دل کے سوا شکوہ کسی سے دل کی حالت کا
ہم اس ویرانے ہی کو وجہِ ویرانی سمجھتے ہیں
قیامت واقعی کوئی مری بستی پہ ٹوٹی ہے
جو زندہ بچ گئے ہیں خود کو لافانی سمجھتے ہیں
میں اپنے خواب بس دو چار لوگوں کو بتاتا ہوں
وہی دو چار جو میری پریشانی سمجھتے ہیں

تجھے ابھی خبر نہیں حواس باختہ ہُوا
کہ تیرا کس چراغ سے پڑا ہے واسطہ ہُوا
مرے بکھرتے بال و پر پہ تالیاں بجاتے شخص
تری طرف نہ چل پڑے خدانخواستہ ہُوا
غبار اڑاتی مقتلوں سے مکتبوں تک آ گئی
نہ جانے کون وحشتوں کی فیض یافتہ ہُوا
اک ایک کر کے ہو رہی ہیں فاختائیں لاپتہ
چمن میں چل رہی ہے کوئی ناشناختہ ہُوا

میں جانتا ہوں اُن کے آشیاں ہیں کس دباؤ میں
وہ جن سے پوچھتی ہے میرے گھر کا راستہ ہُوا
وہ شہرِ خواب جو بسا تھا روشنی کے نام پر
وہاں بنا رہی ہے روشنی کا ضابطہ ہُوا

ہمارے پاس بھی بچنے کا داؤ آخری ہے
تمہارا وار بھی شاید ہواؤ آخری ہے
قدم قدم پہ بشارت یہیں کی دی گئی تھی
سو ہمرہاں یہ ہمارا پڑاؤ آخری ہے
کل اس جگہ پہ ہوا راکھ اڑا رہی ہو گی
ہمارے بیچ یہ جلتا الاؤ آخری ہے
عبور کرنا ہے کس کس نے رات کا دریا
کنارِ چشم یہ خوابوں کی ناؤ آخری ہے
بتا رہا ہے پلٹ کر نہ دیکھنا تیرا
یہ آخری ہے ملاقات، گھاؤ آخری ہے
بس ایک دل ہی تو مانگا ہے دل کے بدلے میں
سو بھاؤ تاؤ نہ کیجے، یہ بھاؤ آخری ہے

دکھائی دیں گی سبھی ممکنات کاغذ پر
ذرا اتار تو لوں شش جہات کاغذ پر
مری کہانی بڑی دیر سے رکی ہوئی ہے
وہ کھو گیا ہے کہیں رکھ کے ہاتھ کاغذ پر
اسی کا عکس ہے میرے کلام تازہ میں
وہ ایک اشک جو ٹپکا تھا رات کاغذ پر
میں رائیگانیاں لکھ لکھ کے تنگ آ گیا ہوں
انڈیل دوں نہ کہیں اب دوات کاغذ پر
مجھے خبر ہے یہ ردّی میں بیچ دیں گے اسے
بنا رہا ہوں میں جو کائنات کاغذ پر

ایاز احمد/لاہور

ابر سے ڈھل گئے ہیں داغِ ایاز　　کس نے فرمایا لاشفا ہونا

ایاز احمد اُن باصلاحیت نوجوان شعرا میں شمار ہوتے ہیں جو غزل کی روایت سے گہرا رشتہ رکھتے ہیں۔ ان کی خاص پہچان مشکل زمینوں میں رواں، بامعنی اور فنی تقاضوں سے ہم آہنگ غزل کہنا ہے، جو ان کے شعری ذوق، عروضی مہارت اور زبان پر گرفت کی دلیل ہے۔ ان کے اشعار میں جذبے کی سچائی، خیال کی تازگی اور اظہار کی شائستگی نمایاں نظر آتی ہے۔ امید ہے کہ وہ اپنے مسلسل مطالعے، ریاضت اور تخلیقی سفر کے ذریعے اردو غزل میں ایک منفرد اور معتبر مقام حاصل کریں گے۔ ان کی شاعری مستقبل کی روشن امکانات کی نوید دیتی ہے۔ (ارژنگ)

زورِ بازو دیکھا تھا نوکِ قلم دیکھ
کاغذی ٹکروں سے آتے پیچ وخم دیکھ
شورِ گریہ سے قفس بھی بچ سکا کب
حلقۂ گرداب میں شعلۂ نم دیکھ
آ رہی ہے اک صدائے کُن دمادم
اس جہاں میں بے بسیٔ جامِ جم دیکھ
ڈھل گئے کچھ داغِ دل باراں سے تو کیا
ایک طوفان باقی ہے رنج والم دیکھ
خار سے کٹ جائے لالہ کا جگر بھی
رنگ وُبو کی دنیا میں یہ کیف وکم دیکھ
سینۂ مومن کی دھڑکن رُک گئی ہے
نجد کے کاشانے میں جاتا حرم دیکھ
معرکۂ کرب میں صبرِ حُسینؑ تھا
ایک لاشے کو اُٹھانے کا تو غم دیکھ
کون کہتا ہے سپہ میری نہیں ہے
اک تماشا ہو بجا طبل وعَلَم دیکھ
زورِ بازو کہنے کو ہے پر ایاز اب
ناتواں ہو جاتا ہے بیت الصنم دیکھ

خدا ناخن نہ دے اہلِ جنوں کو
نہیں چھوڑیں گے دامن میں وہ خوں کو
محبت میں اثر ہے سنتے تھے ہم
لگی مدت گرانے میں فسوں کو
چمک اٹھتی ہیں دیواریں میری پر
لگا اک وقت آنے میں سکوں کو
ہنسی آتی ہے حالِ دل پہ اپنے
لہو سے پانی ہونا تھا جنوں کو
نکل جائیں نہ پیچ وخم تمھارے
سنبھالوں اپنے طرۂ گُزوں کو
چلا جاؤں گا اپنے ہوش آتے
ستاؤ مت رُخِ صیدِ زبوں کو
جدھر چاہیں ادھر دیکھیں ایاز اب
رکھا انگشت پہ دنیائے دوں کو

شوق پھر کوئے یار مانگے ہے
تیر سینے کے پار مانگے ہے
بہہ گیا تیشے سے جنونِ عشق
یہ تو لیل و نہار مانگے ہے
کوچے کوچے میں بک رہی ہے خلش
قیس کا عشق خار مانگے ہے
پہلے غم ہائے عشق ہوتا تھا
اب تو یہ روزگار مانگے ہے
تیرے کاکل میں دم نہیں کہ جنوں
ہستی سے چشمِ مار مانگے ہے
رسمِ منصور ہو ادا پھر سے
سر مرا تختہ دار مانگے ہے
اک تجھے مانگا ہے خدا سے ایاز
کوئی دو کوئی چار مانگے ہے

ہوس کو ہوس ہے ملے اک بدن اور
کہ ہو بانکپن میں نیا بانکپن اور
مرے شعر ہیں وزن میں پر بے معنی
خدا دے تُو لوگوں کو ظرف و زمن اور
زباں دینی ہے حُسن والوں کو گر رب
مجھے دینا دل اور انہیں پھر دہن اور
صبا راہ لگ چھیڑ مت آج مجھ کو
بلاتی ہے ورنہ مجھے انجمن اور
کہاں کی محبت ہو جب دوست تیشہ
کہ خسرو کو تو چاہیے کوہکن اور
کدھر ہے کہاں ہے وہ پروازِ شاہیں
مقدم جسے موت ہو تھے دمن اور
سمجھ پائے عنقا کلام آپ کا لوگ
خدا بھیج دنیا میں اہلِ سخن اور
کہاں چھپ سکے داغِ ہستی ایاز اب
خدا بھیجنا پیرہن اور کفن اور

عشرتِ قتل ہے فنا ہونا
شوق کا بڑھنا بے وفا ہونا
حسرتِ اہلِ داغِ دل مت پوچھ
چاہیے درد بے دوا ہونا
شوق میں وصل کا کسے معلوم
وصل میں تیر آزما ہونا
خود فریبیٔ دل انہیں کہیں کیا
شکوے کا کرنا ہے خطا ہونا
اپنی قسمت کا رونا کیوں روئیں
جب ازل سے تھا طے جدا ہونا
اپنی تعمیر کیسے کرتے ہم
دیکھ کر شمع کا بجھا ہونا
ابر سے ڈھل گئے ہیں داغِ ایاز
کس نے فرمایا لاشفا ہونا

CS CamScanner

یہی جوشِ جنوں تیرا تجھے برباد کر دے گا
یہ کہنا میں تو ہوں تیرا تجھے برباد کر دے گا

ہمایوں راجہ/لاہور

دے رہا ہے کون کس کو یہ سزا اندر مرے
ایک شورِ بدتمیزی ہے بپا اندر مرے
دل یہ چاہے ڈال دوں میں پشت پر تہذیب کو
سن لوں آئے جو بغاوت کی صدا اندر مرے
وار پیچھے سے کسی نے کر دیا ہو گا کہ وہ
شخص ایسے ہی نہیں بیٹھا خفا اندر مرے
جانے کتنی لہریں اٹھیں ڈھلنے کو طوفان میں
زور سے جو چل رہی ہے یہ ہوا اندر مرے
تم نے بھی تو سانس لینا ہے اسی کے بیچ میں
بن رہی ہے نفرتوں کی جو فضا اندر مرے
کچھ نہ کچھ تو بولے گی اور کچھ نتیجہ نکلے گا
اب مچلتی رہتی ہے جو اک انا اندر مرے
ہر جگہ برپا جو کر دے ایک طوفانِ جنوں
ایسی لہریں اے خدا اب تو اٹھا اندر مرے
بھر دے میرے دل کو ایسے حوصلے سے یا خدا
مل نہ پائے کچھ جگہ تیرے سوا اندر مرے
مہربانوں نے دکھائی مہربانی ٹوٹ کر
نفرتوں کی پھیلی ہے جو اک وبا اندر مرے
مجھ کو رہنا تھا اگر ان بے وفا لوگوں میں تو
کیوں ہے ڈالی اے خدا تو نے وفا اندر مرے
اب کھڑا ہے صبر بھی خود ظلم کی دہلیز پر
اب بغاوت ڈال دے تو اے خدا اندر مرے
دیکھتا ہوں اے ہمایوں حوصلہ تیرا کمال
تجھ کو دیکھوں تو ہے بڑھتا حوصلہ اندر مرے

عشق میں فنا کا جو انتخاب کر لیا
ناخدا کے قرب سے اجتناب کر لیا
ہم نے اپنا ایک الگ ہی نصاب کر لیا
عشق کا حساب جو بے حساب کر لیا
پھر کسی سراب کی سمت میں نہ جاؤں گا
عہد تجھ سے دوریوں کا جناب کر لیا
یہ جو ہیں حقیقتیں جھوٹ پر کھڑی ہیں سب
زندگی کو ہم نے اب ایک خواب کر لیا
عہد و پیاں ڈھارسیں یہ تکلفات ہیں
کیوں وفا کے جرم کا ارتکاب کر لیا
اب کے تیری آنکھ نے سچ بتا دیا مجھے
اب کے تیرے جھوٹ کو لاجواب کر لیا
قربتوں کا دور اب الوداع ہو گیا
کج ادائیوں کا اب احتساب کر لیا
بے شمار راز جو کھل رہے ہیں ہم پہ اب
ہم نے تیری ذات سے جو حجاب کر لیا
ہیں کمال منزلیں جستجو کی راہ میں
میرا جو سوال تھا وہ جواب کر لیا
راحتیں بھی مل گئیں اور سکون بھی مجھے
راحتوں نے مجھ سے اب جو نقاب کر لیا
ہے کمالِ عشق یا جستجو کا معجزہ
ایک نقطہ تھا جسے ایک باب کر لیا
قرب کی فضیلتیں ہو گئیں کمال کی
اک ستارے کو جو اب آفتاب کر لیا
مجھ کو بات کرنے میں اک جھجک ہمیشہ تھی
پھر بھی اس خموشی نے اک خطاب کر لیا

آرائشِ مکاں میں مکیں کو بھی دیکھنا
کعبے کو دیکھتے ہو جبیں کو بھی دیکھنا
کرتے رہو تلاش اُسے کائنات میں
پوشیدہ خود میں یارِ حسیں کو بھی دیکھنا
رو بہ زوال ہیں سبھی یہ عظمتیں یہ شان
جو آسماں کو دیکھو زمیں کو بھی دیکھنا
گرچہ مسرتوں کے ہیں سامان بے شمار
اطراف میں تُو قلبِ حزیں کو بھی دیکھنا
رہتے مگن ہو خود پہ جو تم التفات میں
اندر مقیم گوشہ نشیں کو بھی دیکھنا
خود کی تلاش میں تُو ہمایوں بھٹکتا رہ
پہلو میں اپنے خاک نشیں کو بھی دیکھنا

یہی جوشِ جنوں تیرا تجھے برباد کر دے گا
یہ کہنا میں تو ہوں تیرا تجھے برباد کر دے گا
کہ خود سے وعدہ کر لینا کہ رکھنا یہ ارادہ بھی
ہمیشہ میں رہوں تیرا تجھے برباد کر دے گا
یہ سمجھایا تھا ناصح نے ہے تیرا عشق بربادی
چرا کر یہ سکوں تیرا تجھے برباد کر دے گا
علاوہ اسکے تھا مسکن کئی سپنوں کا دل میرا
کہ اِس کو میں کہوں تیرا تجھے برباد کر دے گا
کہ تیرا سوچنا اس کو کہ خوابوں کو جگانا بھی
کہ کیسے میں بنوں تیرا تجھے برباد کر دے گا
وہ اندر ہی جلے جانا وہ اندر ہی بجھے جانا
یہی سوزِ دروں تیرا تجھے برباد کر دے گا
کھڑا ہے تو ہمایوں کچھ دلیلوں کے سہاروں پر
کہ گرنا یہ ستوں تیرا تجھے برباد کر دے گا

CamScanner

محبت سے کون ڈرتا ہے

عامر بن علی/ جاپان

سچی بات تو یہ ہے کہ ہم سبھی لوگ محبت کرنے سے ڈرتے ہیں۔ اس کی ایک ممکنہ وجہ تو شاید اطالوی فلسفی میکاولی کا دی پرنس میں درج یہ مشورہ بھی ہوسکتا ہے کہ، محبت کے مقابلے میں نفرت زیادہ بہتر ہے، کیونکہ محبت انسان کو کمزور بناتی ہے اور لاپرواہی کی طرف لے جاتی ہے، جبکہ نفرت آدمی کو مضبوط بناتی ہے اور دشمنوں سے چوکنا رکھتی ہے۔ لہٰذا بادشاہ کو چاہیے کہ وہ دل میں محبت پالنے کی بجائے نفرت کو زیادہ جگہ دے، اسی کو وتیرہ بنائے اگر کامیاب حکمران بننا چاہتا ہے۔ فنکار لوگ مگر الگ مزاج رکھتے ہیں اور محبت سے کام لیتے ہیں۔ بالخصوص شاعر کا احساس بہت نازک ہوتا ہے۔ ماحول کی ناہمواریوں پر اس کا ردعمل خاصا شدید ہوتا ہے، اس وقت میرے سامنے مقبول شاعر حسن عباسی کی طویل نثری نظم "محبت سے کون ڈرتا ہے " کتابی صورت میں موجود ہے۔ حسن عباسی کی شاعری کی عمر ربع صدی سے تجاوز کر چکی ہے۔ ان کی نظم نے ارتقاء کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی سعی اور مضامین اختراع کیے بلکہ انہیں اپنے اسلوب اور لہجے کی تازگی بھی عطا کی ہے۔

یوں تو ادب اور سوانح مختلف شعبے ہیں مگر ہم بڑے ادب کو غمِ ذات سے الگ نہیں کر سکتے۔ شاعر بھی غمِ عشق کو غمِ دنیا اور غمِ دنیا کو غمِ عشق میں مدغم کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ اس نظم سے حسن عباسی کی شخصیت کا جو نقش مرتب ہوتا ہے، اس میں زمانے سے نبرد آزما ہونے کا رجحان تو نظر آتا ہے لیکن دنیا داری کا خودغرضانہ رویہ آشکار نہیں ہوتا۔ جذبات کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ زمانے پر ایک مفکر کی نظر ڈالتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جا بجا نظر آتا ہے کہ شاعر نے غمِ حیات کو غمِ کائنات سے ہم آہنگ کر لیا ہے۔ زمانے کے بدلتے تیوروں کو نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ ان سے پریشان انسانوں کا کرب بھی محسوس کرتے ہیں۔ ذاتی طور پر میں علمِ عروض کی کلاسیکی روایت کی پابندی کرتے ہوئے کی گئی شاعری کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ نثری نظم کی اہمیت کا مگر میں قائل ہوں۔ شاعری کے ارتقاء میں نثری نظم ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ بحر، قافیہ، ردیف کی اپنی خوبصورتی اور موسیقیت ہے۔ حسن عباسی کا کمال یہ ہے کہ وہ بیک وقت کلاسیک روایتی شاعری میں اپنا مقام اور اعتبار رکھتے ہیں، مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ نثری نظم کو ایک نئی بلندی پر لے گئے ہیں۔ وہ ایک تازہ فکر شاعر ہے، جس پر وقت آج تک شب خون نہیں مار سکا۔

یہ نظم اردو زبان وادب کے ارتقائی سفر میں ایک سنگِ میل کی سی اہمیت وحیثیت رکھتی ہے۔ کشور ناہید نے دیباچے میں بڑی خوبصورت بات کی ہے کہ یہ استفہامیہ مصرعہ بھی ہے اور سوالیہ بھی کہ کس میں حوصلہ ہے، پہلے محبت کرنے، اس کو اندر اتارنے اور پھر اس کو اپنے ہمدم میں ایسے سرایت کرنے کا جیسے سوکھی زمین بارش کا پانی جذب کرتی ہے۔ حسن عباسی محض رومانوی شاعر نہیں ہے۔ یہ طویل نظم محبت کو ترازو میں رکھتی، اتارتی، پھر رکھتی ہے۔ محبت کی دنیا میں امن، خوشی اور یگانگت لاتی ہے۔ مگر ایک شاعر جب محبت کی تشریح کرتا اور اس کے گزرے اور آنے والے زمانوں پر منطبق کرتا ہے تو کبھی اسے عورت کا پھٹا ہوا دوپٹہ یاد آتا ہے۔ کبھی یہ اعلان کہ تم عورت ہوتے ہوئے بھی موت کو ڈرا سکتی ہو مگر میں اور میرے جیسے مرد، جنگ کرنے، دوسروں پر حاوی ہونے، ملکوں ملکوں تخت و تاراج کرنے پر تلے ہوتے ہیں۔ انجام ہر قدم، ہر منزل پر یہ ہوتا ہے کہ رنگ، نسل اور مذہب کے ہاتھوں ہم فتح کے باوجود شکست کھا جاتے ہیں۔ یہاں مقدس کبوتر بھی بے بس ہیں۔ زمانے کی نامرادیوں اور دوغلے پن کے اپاہج لمحوں میں ہم صدیوں سے زندہ ہیں۔

پوری نظم "تم "سے مخاطب ہے۔ کبھی یہ عورت ہے، کبھی زمانہ، کبھی فطرت اور کبھی مرد اور کبھی وہ قفسِ جہاں، جہاں بے گناہوں کو قید کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ خدا کی جانب جب وہ لوٹ کر جائیں گے تو موت بھی اندھیری راہوں میں ان کو راستہ نہیں دے گی۔ شاعر زندگی کے المیہ اور خوش کن منظروں کو ایک دوسرے سے منسلک کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ ساری اذیتوں کی تفصیل دینے کے باوجود ہر سطر، ہر شعر، ہر لائن میں محبت کی مہک اور دلار کے تجربے کو مربوط کرتے ہوئے "تم " کو نہیں بھولتا۔ اس نے خاموشی کے پرانے صندوق کھولے ہیں۔ دیباچے کی بات کر رہے ہیں تو یہ واقعی حقیقت پر مبنی بات ہے جس کی طرف اصغر ندیم سید نے توجہ دلائی ہے کہ اس طویل نظم میں مناظر اتنی تیزی سے بدلتے ہیں کہ جیسے کوئی تجرباتی نظم اپنے Visuels کو تاش کی گڈی کی طرح پھینٹتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ حیرت اس بات کی ہے کہ حسن عباسی میں یہ تبدیلی کیسے رونما ہوئی کہ غزل، حمد، نعت اور نظم سے طویل نظم کا سفر اور وہ بھی اس رجحان کے ساتھ، یہ اصل حیرت ہے۔ معاملہ محبت کا ہے اور قصہ یہ ہے کہ ایک ساج تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ جب لوگ محبت سے ڈرتے تھے۔ مگر اب محبت سے کون ڈرتا ہے کا زمانہ ہے تو پھر محبت کے لیے کسی کو صدیوں کی نیند سے بیدار کرنے کے لیے اس مونولاگ کا سہارا لیا گیا ہے۔ عالمی شاعری کی طویل نظموں

میں تاریخ، تہذیب، تمدن، جغرافیائی منظرنامے، فلسفیانہ اظہار اور معاشرتی لینڈ سکیپ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ نظم کے فیبرک میں گندھا ہوتا ہے۔ مثلاً امریکی شاعر والٹ وٹمین کی طویل نظم کا نام ہے "Song of Myself" اس طویل نظم میں والٹ وٹمین نے اپنی رومانی، جذباتی، فکری اور تمدنی زندگی کو ایک نغمے میں ڈھالنے کی کمال کوشش کی ہے۔ اب ایسے ہی حسن عباسی نے محبت کے تجربے کو فلسفیانہ جہتوں کے ساتھ ایک ایسے منظرنامے میں لانے کی کوشش کی ہے جس میں ہر منظر ایک کہانی ہے۔ کوئی کہانی کسی کلاسیکی فلم میں دکھائی دے گی۔ کوئی کہانی کسی مصوری میں قید ہوگی۔ کوئی کہانی کسی ناول کے منظرنامے میں ہوگی۔ کوئی کہانی کسی تمثیل میں ہوگی۔ پوری نظم کائنات کے لینڈ سکیپ میں جمع ہوگئی ہے۔ دنیا کے تاریک جنگل، معبد خانے، بارشوں کی گزرگاہیں، دنیا کے سیاحت کے مقامات، دنیا کے موسموں کی گزرگاہیں، دنیا کے تاریخی مقامات کے استعارے، دنیا کے مذاہب اور عقیدوں سے جڑی ہوئی حکایتیں۔ لوک کہانیوں اور قصوں کی فضا میں شامل کرداروں کی جھلکیاں اور ایک متحرک ڈرامائی منظرنامہ اس طویل نظم میں سلسلہ وار دکھائی دیتا ہے۔ یہ طلسم کاری مونولاگ کی صورت جاری رہتی ہے اور محبت کی پرتوں کو اُجاگر کرتے ہوئے اپنے مرکزی فکری دھارے میں قاری کو بہائے لیے جاتی ہے۔ شاعر کے مطالعے، مشاہدے، تجربے اور بصری قوت نے اس نظم میں ایک ایسی Dynamics کو جنم دیا ہے جو محبت کے تجربے کی بہت مختلف اور متنوع Manifestation کو سامنے لاتا ہے

✦✦✦

چلی ہیں ایسی ہوائیں ہماری بستی میں
ہوئی ہیں خواب وفائیں ہماری بستی میں
جو سادہ دل کوئی بھولے سے جرمِ عشق کرے
بہت کڑی ہیں سزائیں ہماری بستی میں
یہ بد دعا کا اثر ہے کہ امتحاں کی گھڑی
ہیں بے اثر سی دُعائیں ہماری بستی میں
اسی لیے تو چھپا آفتاب خوشیوں کا
ہیں آج غم کی گھٹائیں ہماری بستی میں
غبارِ خوف یا لالچ ہے سارے ذہنوں پر
دبی ہیں سچی صدائیں ہماری بستی میں
یہ چند چاک گریبان والے بھی جو اُٹھے
کریں گی راج جفائیں ہماری بستی میں
ہے مشورہ جو مسافر ہیں اس طرف کے لیے
کلیجہ تھام کے آئیں ہماری بستی میں

عامر بن علی/ لاہور

Sorry

جو تو نے کہا تھا
برا سا لگا تھا
جبھی کہہ گیا ہوں میں چند ایسی باتیں
کسی طور پر بھی جو کہنے کی نہ تھیں
ہے ممکن تمہیں بھی لگا ہو برا سا
یہی سوچ کر کب سے بے چین ہے من
مجھے معاف کرنا میرے دوست ہمدم
جو میں نے کہا تھا
جو تو نے سنا تھا
مرا ویسا مطلب تو ہرگز نہیں تھا
مجھے معاف کرنا

عامر بن علی/ لاہور

طلسم شب میں سحر کی نمو اتارتا ہے
چراغ کوئی مرے چار سو اتارتا ہے
نکالتا ہے بھنور سے ہمیں کنارے تک
سنبھالتا ہے کبھی جستجو اتارتا ہے
وہ ایڑیوں کو اٹھا کر بھی چل نہیں سکتا
جسے غرور کی مسند سے تو اتارتا ہے
مصوری کا ہنر مجھ پہ آزماتے ہوئے
کوئی وجود میں خاک نمو اتارتا ہے
مرے مزاج میں نفرت کا شائبہ ہی نہیں
یہ کون آنکھ کے اندر لہو اتارتا ہے
خیال و خواب میں پیکر سے بنتے جاتے ہیں
یہ کون دل میں تری آرزو اتارتا ہے
یہ سارا فیض ملا ہے وہاں کی مٹی سے
ہمیں مدینے میں وہ باوضو اتارتا ہے
میں اس کی ناؤ ڈبونے پہ آ گیا تھا نوید
کنار آب مجھے کیوں عدو اتارتا ہے

محمد نوید مرزا/ لاہور

اسے میں کیوں نہ کہوں سائبان جیسا تھا
جو میرے سر پہ کسی آسمان جیسا تھا
تمہیں تو حق نہیں تھا بجلیاں گرانے کا
مرا جہان تھا میرا مکان جیسا تھا
بندھا ہوا تھا کسی اک نحیف ڈوری سے
نہیں رہا وہ مرا تجھ پہ مان جیسا تھا
خوشا نصیب ہوا اختتام خیر کے ساتھ
جو زندگی کا سفر امتحان جیسا تھا
تمہیں کنارے تلک دیپ لے کے آیا ہے
یہ اور بات ، مرا بادبان جیسا تھا

شہزاد دیپ/ جھنگ

نظم شخصی دائرہ: احمد ندیم رفیع

حسن عباسی/لاہور

شخصی دائرہ-عورت کی داخلی کائنات کا

اساطیری مکالمہ

شخصی دائرہ (Personal Space)

سنا ہے اس کے شخصی دائرے میں
سات رنگی تتلیاں آزاد پھرتی ہیں
کبھی پلکوں کو چھوتی ہیں
کبھی ہونٹوں پہ آ کر بیٹھ جاتی ہیں
ذرا سی دیر میں مدہوش ہو کر
ہولے ہولے اپنے رنگیں پر ہلاتی ہیں
کبھی اُڑ کر سنہرے گیسوؤں کی باڑ پر
مہکے گلابوں کی طلائی چھاتیوں سے منہ لگاتی ہیں
سلیقے سے زرِ گُل کو ہٹاتی ہیں
حیات افروز شیریں رس چُراتی ہیں
کبھی تھک جائیں تو باہوں کی شاخوں میں
سمٹ کر دیر تک آرام کرتی ہیں
کوئی بھنورا اگر آ جائے تو
اپنے پروں کے کچے رنگوں کی دھنک سے
اس کا چہرہ ڈھانپ دیتی ہیں
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کوئی تتلی بھٹک کر
اجنبی پھولوں پہ جا کر رقص کرتی ہے
تو وہ ناراض ہو کر اپنا آنچل کھینچ لیتی ہے
سنا ہے اس کے شخصی دائرے میں
چاندنی کے حوض ہیں
جن میں خیالوں کی حسیں پریاں
برہنہ تن اتر کر رات بھر اشنان کرتی ہیں
بدن کی روشنی سے انجم و مہتاب کو حیران کرتی ہیں
کبھی ہنستی ہوئی غوطے لگاتی ہیں
کبھی آ کر کنارے پر اداسی سے کسی کی راہ تکتی ہیں
کوئی بھٹکا مسافر اتفاقاً سامنے آ جائے تو
بھیگی ہوئی زلفوں کی چادر تان لیتی ہیں

سنا ہے اس کے شخصی دائرے میں
اَن کہی باتوں کے باغیچے مہکتے ہیں
جہاں بے موسمی سرگوشیوں کے پھول کھلتے ہیں
اور ان پھولوں پہ ایجابِ خفی کی اوس گرتی ہے
مگر یہ بھی سنا ہے
اس چمن کے ایک نامعلوم گوشے میں
سراپا بے حجابانہ محبت کے جھروکے ہیں
جھروکوں سے پرے برگِ تمنا سے لدے
خودرو درختوں کی قطاریں ہیں
درختوں پر سماعت کی پھواریں ہیں
بہاریں ہی بہاریں ہیں

سنا ہے اس کے شخصی دائرے میں
خامشی کا بہتا دریا ہے
جہاں پر نیم شب انجانی منزل کی طرف
خوابوں کی اک ناؤ نکلتی ہے
وہ ناؤ چلتے چلتے جب اندھیری رات کی چُپ میں
کسی کروٹ کے ہچکولے سے ہلتی ہے
تو موسیقی کی لہروں پر
کبھی کنگن کھنکتا ہے
کبھی پائل چھنکتی ہے

سنا ہے اس کی شخصی دائرے میں
وقت کا رخشِ سبک رفتار
آہستہ دبے پاؤں گزرتا ہے
نگاہِ دیدۂ دل کا تہی پیمانہ
دھیرے دھیرے بھرتا ہے
ستارے چاند سورج اس کی منشا سے نکلتے ہیں
زمانہ اس کے ابرو کے اشاروں پر
نئی کروٹ بدلتا ہے
کبھی صبحِ درخشاں عارض و رخسار پر رک کر
شفق کے ڈول بھرتی ہے
کبھی چشمِ شبِ دیجور چپکے سے
سرِ آئینۂ زلفِ سیہ کاجل لگاتی ہے

سنا ہے اس کے شخصی دائرے میں
زندگی آرام کرتی ہے
تمازت گاہِ قربت کی مہکتی خواب گاہوں میں
بدن اور روح کا بارِ دگر ادغام کرتی ہے
گزرتی رات کے کاندھوں پہ سر رکھ کر
پریشاں مضمحل سانسوں کو پھر ہموار کرتی ہے
نشاطِ کار کے بجھتے ہوئے آتش کدوں کو
از سرِ نو آگ سے گلنار کرتی ہے
قنوط و یاس کے ہر وار کو ناکام کرتی ہے
کبھی اَن دیکھے اندیشوں کو طشت از بام کرتی ہے

سنا ہے اس کے شخصی دائرے میں
نت نئے خوابوں کے امکانات روشن ہیں
سرِ چشمِ سیہ تعبیر کی شمعیں فروزاں ہیں
پسِ مژگاں تمناؤں کی تمثیلات روشن ہیں

CamScanner

نگاہِ تیز کے پھیلے ہوئے نیلے سمندر میں
تخیل کے کسی سرسبز جادوئی جزیرے پر
حقیقت جل پری کا رُوپ دھارے
حُسنِ کم آمیز کے جلوے دکھاتی ہے
بَنی آدم کی پنہاں خواہشوں کو آزماتی ہے

سنا ہے اس کے شخصی دائرے میں
ذات کا حیرت کدہ ہے
اور اس حیرت کدے میں خوبصورت پیرہن کی
سات رنگی آبشاروں کے عقب میں
ایک پُراسرار وادی ہے
جہاں بندِ قبا کا (سات گرہوں سے مزیّن) باب کھلتا ہے
سنا ہے اس مزیّن باب سے آگے
طلسماتی مناظر کی عجب خیز دُنیا میں
کہیں کوہِ حلاوت ہے، کہیں چاہِ زنخداں ہے
کہیں ناف پیالہ ہے، کہیں درزِ پُرافشاں ہے

سنا ہے اس کے شخصی دائرے میں
آخرِ شب وصل کی کلیاں چٹک کر
آرزوؤں کے کٹوروں میں شرابِ لمس بھرتی ہیں
طلب کی بارگاہوں میں کنواری داسیاں
مدہوش ہو کر رقص کرتی ہیں
بالآخر اس کشاکش کے کسی پُرشوخ لمحے میں
محبت آفرینش کے دہانے کھول دیتی ہے
رگِ جاں میں نمودِ زندگانی کی لطافت گھول دیتی ہے

✧✧✧

یہ نظم شخصی دائرہ ایک ایسی تخلیقی دنیا کا نقشہ ہے جہاں عورت کا باطن، اس کی آزادی، اس کی خاموشی، اور اس کا تخیل سب ایک ساتھ سانس لیتے ہیں۔ احمد ندیم رفیع نے عورت کے وجود کو کسی محدود جسم یا مکان کے طور پر نہیں دکھایا، بلکہ اسے ایک پوری کائنات کے روپ میں پیش کیا ہے۔ ایسی کائنات جہاں خواب، خوشبو، روشنی، خاموشی اور لمس سب زندہ مظاہر کی طرح بولتے ہیں۔

شخصی دائرہ دراصل ایک باطنی کائنات ہے، جہاں عورت اپنی مرضی سے وقت کو بدلتی ہے، اپنی خواہشوں کو معنی دیتی ہے، اور زندگی کو نئے سرے سے تخلیق کرتی ہے۔ یہ نظم عورت کی آزادی اور خودمختاری کی گواہی دیتی ہے، مگر یہ آزادی محض جسمانی نہیں بلکہ روحانی، فکری اور جمالیاتی ہے۔ اس نظم میں عورت ایک ایسی مخلوق ہے جو خود اپنی دنیا بناتی ہے، جس کے گرد سب کچھ اس کے اشارے سے چلتا ہے۔

ورجینا ولف (Virginia Woolf) کہتی ہے:

The room, then, is not a retreat from the world but the center from which the world is reimagined.

یعنی "عورت کا کمرہ یا اس کی خلوت دنیا سے فرار نہیں بلکہ وہ مرکز ہے جہاں سے دنیا کو نئے معنی ملتے ہیں۔"

یہ قول اس نظم پر بالکل منطبق ہوتا ہے۔ شاعر نے عورت کے شخصی دائرے کو ایک ایسی تخلیقی جگہ دکھایا ہے جہاں سے زندگی، وقت، اور کائنات کی نئی صورتیں جنم لیتی ہیں۔ چاندنی کے حوض، سات رنگی تتلیاں، خاموشی کا دریا یہ سب اس عورت کے ذہن کے استعارے ہیں۔

ایلیٹ (T. S. Eliot) نے کہا تھا:

A symbol is never a mere ornament; it is an active agent in the creation of meaning.

یعنی "علامت محض آرائش نہیں بلکہ معنی پیدا کرنے کا ایک فعال ذریعہ ہے۔"

یہ بات اس نظم کے ہر منظر میں محسوس ہوتی ہے۔ تتلیاں عورت کے آزاد تخیل کی علامت ہیں جو کبھی ہونٹوں پر بیٹھتی ہیں، کبھی گیسوؤں میں اڑتی ہیں، کبھی گلابوں سے رس چراتی ہیں۔ کبھی طلائی چھاتیوں کو منہ لگاتی ہیں چاندنی کے حوض عورت کے اندر کی پاکیزگی اور روح کی روشنی ہیں۔ خاموشی کا دریا اس کی داخلی سکونت، اس کی گہری سوچ، اور مراقبہ کی کیفیت ہے۔ شاعر کے ہاں ہر منظر محض حسن نہیں بلکہ معنی کی ایک پرت ہے۔

اسی طرح سیمون دی بووآر (Simone de Beauvoir) کے مطابق:

She is not the other; she is herself the origin of meaning.

''عورت کوئی دوسرا نہیں، وہ خود اپنی ذات ہے معنی کی ابتدا وہی ہے۔''

یہ نظم اسی شعور کی عکاس ہے۔ یہاں عورت کسی دوسرے کی خواہش کا عکس نہیں، بلکہ وہ خود معنی کی خالق ہے۔ وقت اس کے اشارے پر چلتا ہے، کائنات اس کے لمس سے رنگ بدلتی ہے، اور زندگی اس کے سانس لینے سے تازہ ہو جاتی ہے۔ اس کا دائرہ عورت کے اختیار اور اس کے تخلیقی حق کی تمثیل ہے۔

کارل یونگ (Carl Jung) نے لکھا

Until you make the unconscious conscious, it will direct your life and you will call it fate.

''جب تک تم اپنے لاشعور کو شعور میں نہیں لاؤ گے، وہی تمہاری زندگی کو چلائے گا، اور تم اسے تقدیر کہو گے۔''

احمد ندیم رفیع کی یہ نظم دراصل اسی عمل کی تصویری شکل ہے۔ عورت کے اندر کا شخصی دائرہ اس کے لاشعور کا باغ ہے، جہاں تتلیاں، پریاں، پھول، اور نغمے دراصل اس کے چھپے ہوئے احساسات اور خوابوں کی تصویریں ہیں۔ وہ ان کے ذریعے خود کو پہچانتی ہے، اور یہ پہچان ہی اس کی تخلیق اور آزادی کی بنیاد بنتی ہے۔

ایلیٹ کا ایک اور جملہ ہے:

Poetry is not the turning loose of emotion, but the escape from emotion into rhythm and form.

" :شاعری محض جذبات کا اخراج نہیں بلکہ ان جذبات کو لَے اور ساخت میں ڈھالنے کا فن ہے۔"

یہی بات شخصی دائرہ پر بھی صادق آتی ہے۔ نظم میں جذبات ضرور ہیں، مگر بے قابو نہیں۔ شاعر نے انہیں زبان کی نرمی، تکرار کی لَے، اور منظر کے حسن میں جذب کر دیا ہے۔ سنا ہے کی بار بار تکرار نظم کو نغمگی عطا کرتی ہے، جیسے کوئی روایت، کوئی قصہ، کوئی خواب دھیرے دھیرے کھل رہا ہو۔

نارتھروپ فرائے (Northrop Frye) کہتا ہے:

Love is the creative fire that renews the universe.

یعنی ”محبت وہ تخلیقی آگ ہے جو کائنات کو ہمیشہ نیا کرتی رہتی ہے۔“

یہ قول اس نظم کے آخری حصے کی وضاحت کرتا ہے۔ جب شاعر کہتا ہے کہ

سنا ہے اس کے شخصی دائرے میں
آخرِ شب وصل کی کلیاں چٹک کر
آرزوؤں کے کٹوروں میں شرابِ لمس بھرتی ہیں“

تو یہ صرف جسمانی لمحہ نہیں، بلکہ تخلیقِ نو کا استعارہ ہے۔ یہاں محبت ایک تخلیقی قوت بن جاتی ہے جو زندگی کو تازہ کرتی ہے، وجود کو توانائی دیتی ہے، اور عورت کو کائنات کے مرکز میں رکھتی ہے۔

کلینتھ بروکس (Cleanth Brooks) کے الفاظ میں:

The poem does not describe; it reveals. And what it reveals is not the world, but the self seeing the world.

”نظم بیان نہیں کرتی، وہ منکشف کرتی ہے اور جو کچھ منکشف کرتی ہے وہ دنیا نہیں بلکہ وہ خود ہے جو دنیا کو دیکھ رہی ہے۔“

یہی اس نظم کی اصل روح ہے۔ شخصی دائرہ کسی عورت کے بدن یا اس کے اردگرد کے مناظر کا بیان نہیں، بلکہ اس عورت کے دیکھنے، محسوس کرنے اور تخلیق کرنے کے زاویے کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ نظم قاری کو باہر کی دنیا سے نہیں بلکہ اپنے اندر کی دنیا سے متعارف کراتی ہے۔

آخرکار، یہ نظم عورت کی ذات کا وہ مکالمہ ہے جو وقت، خواب، محبت، خاموشی، اور روشنی کے استعاروں میں بولا گیا ہے۔ یہ نظم عورت کی خودی کو جمالیاتی انداز میں پیش کرتی ہے، ایسی خودی جو مرد کی تعریف سے آزاد ہے جو اپنی روشنی خود ہے، جو اپنے دائرے میں پوری کائنات رکھتی ہے۔ یہاں عورت محض ایک وجود نہیں، بلکہ وہ اصلِ تخلیق ہے۔

یوں شخصی دائرہ دراصل زندگی کے اس لمحے کی علامت ہے جہاں وجود اپنے حسن، اپنے راز، اور اپنی آزادی کے ساتھ مکمل ہو جاتا ہے۔

❖❖❖

(بشکریہ: ”ادبِ لطیف“)

کہیں ستارہ، نہ جگنو کوئی، ضیا کے لیے
میں کس سفر میں ہوں کس جرم کی سزا کے لیے

ہر ایک سمت رواں ہے فصیلِ آئینہ
بھٹک رہی ہے نظر شکلِ ماسوا کے لیے

عجب طلسمِ سفر ہے کہ راہِ ہستی میں
ترس گیا ہوں میں اپنے نشانِ پا کے لیے

برہنہ کر گئی سورج کی روشنی مجھ کو
لکھا گیا تھا میں صفحاتِ شب نما کے لیے

لکیریں کھینچ گیا ابر زرد مٹی میں
حروفِ سبز نمایاں ہوئے صبا کے لیے

بکھر گیا مرا چہرہ، پگھل گئیں آنکھیں
اب اس حجاب سے باہر نکل خدا کے لیے

صدائیں دیتے ہیں منظر اُجاڑ گلیوں کے
میں کھولتا ہوں دریچہ اگر ہوا کے لیے

سسکتا رہتا ہوں الفاظ کے ہیولوں میں
کوئی لباس نہیں پیکرِ صدا کے لیے

مرا وجود، دلیلِ عدم ہے دُنیا میں
سفر میں رہتا ہوں میں قریۂ فنا کے لیے

نذیر قیصر/لاہور

بقیہ انٹرویو: افضل مراد

جہاں تک سیاسی فضا کی بات ہے اُن دنوں معلومات کا سارا دارومدار ریڈیو پر تھا ابا شام کے وقت چنار کے درخت تلے قالین بچھا کر بیٹھتے اور ریڈیو سنتے ہم پرانے گانے اچھے لگتے۔۔۔مجھے یاد پڑتا ہے ایک شام ریڈیو پر گانا بج رہا تھا

یہ زندگی کے میلے دنیا میں کم نہ ہوں گے
افسوس ہم نہ ہوں گے

تمام تر ناسمجھی کے باوجود یہ گانا سنتے سنتے میں رو پڑا تھا، اماں نے سینے سے لگایا بہت پیار دیا اور بار بار پوچھتی رہیں۔۔۔، کیا ہوا کسی نے کچھ کہا ہے۔۔کوئی بات ہوئی ہے۔۔۔۔!

خود میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔۔۔میں کیا بتاتا!

ہمارے شہر میں تازہ تازہ کچھ روزنامہ اخبارات شائع ہونے لگے تھے۔ دنیا بدلنے کی خبریں آ رہی تھیں

ریڈیو کی جو آوازیں سماعتوں سے ٹکرا رہی تھیں اُن میں نان الائنس موومنٹ کی بیک ڈور گفتگو کے چرچے تھے افریقی ممالک کے جنگلات اور معدنیات پر عالمی ممالک کی سجارہ داری کے خدشات بڑھ رہے تھے، سوویت یونین کے عالمی طاقت بننے کی خبریں تھیں دنیا کے بہت سے ممالک سائنس اور ٹیکنالوجی میں آگے بڑھ رہے تھے۔۔۔ہمارا ملک اپنے سرحدی تضادات میں الجھا ہوا تھا۔۔۔۔ہمسایوں سے دشمنی بالغ ہوتی جا رہی تھی۔۔۔۔، بلوچستان کی قوم پرست پارٹیوں کو 73 کے آئین کی رُو سے مختصر مدت کی حکومت ملی۔۔۔۔پھر معطل کی گئی۔ ۔پھر شدید ردِعمل آیا۔۔۔ان دنوں ملک ٹوٹنے اور بنگلہ دیش بننے کا بڑا چرچا تھا قیدیوں کی باتیں ہو رہی تھیں

روسی ادب کی مقبولیت اور روشن خیالی کی تحریکیں اپنا اثر دکھا رہی تھی ۔۔۔اُدھر ہمارا بچپن رخصت ہو رہا تھا اور ہم بڑی جماعتوں کے اسیر ہو گئے تھے، اب ریڈیو کی جگہ ٹیلی وژن کی نشریات نے لے لی تھی !!!

ارژنگ: ادب سے شوق کی ابتدا؟

افضل مراد: کتابوں کی دنیا سے تعارف یا واقفیت اپنے ہمسائے میں رشتے کے ماموں نامور ادیب، محقق اور ماہر لسانیات ڈاکٹر عبدالرحمن براہوئی کی لائبریری میں جا کر ہوا۔۔شاعری، افسانہ یا تراجم کی کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتے ہماری داخلی دنیا بدلتی چلی گئی۔ ابتدا میں بچوں کی کہانیاں اور نظمیں لکھیں، بچوں کے رسائل میں اشاعت اور ریڈیو کے پروگراموں میں حوصلہ افزائی کے بعد شوق پروان چڑھتا گیا۔۔۔۔تب مطالعے نے سب سے بڑے استاد کی حیثیت اختیار کی۔۔۔۔موضوع، فن اسلوب اور فکشن کے دوسروں تقاضوں سے واقفیت ہونے لگی۔۔۔۔یا ہمارا اعتماد بڑھتا گیا۔۔۔۔لیکن خود کو شاعر ادیب کہنے میں جھجک رہی۔۔۔۔جواب بھی ہے۔۔۔۔کوئی اور کہے سو کہے، خود کو خود متعارف کرنا کبھی نہیں آیا۔

ارژنگ: آپ شعر کہتے ہیں . ناول لکھتے ہیں، مقبول کالم نویس ہونے کے ساتھ ساتھ کم وبیش تمام اصناف سخن میں آپ نے تخلیقی کام کیا ہے، ہائیکو میں بھی آپ کو اتھارٹی مانا جاتا ہے, زیادہ محبوب کونسی صنف سخن ہے؟

افضل مراد: صنف کا انتخاب اور اپنی پہچان کا حوالہ بنانے کا انتخاب یہ کبھی نہیں سوچا کوئی خیال نظم کی صورت اُترا تو کوئی آئیڈیا ڈرامہ بنا کسی کردار نے افسانہ لکھوایا تو کہیں تراجم میں خود کی تلاش کی۔۔۔۔بلکہ تحقیق کے شعبے میں بھی دخل اندازی کی ڈرامے کی تاریخ وارتقا پر ایم فل کا سرٹیفکٹ حاصل کیا۔۔۔خاکے بھی لکھے۔۔۔اور بہت سارے ڈرامہ سیریل بھی۔ جہاں تک ہائیکو کی بات ہے تو ہائیکو سے پہلے واقفیت ہوئی پھر تراجم کے ذریعے دوستی اور اب دو تین ہائیکو کے مجموعے شائع ہونے کے بعد ہائیکو میری محبت ہے۔ ہائیکو کی صنف میں مکالمہ خصوصا فطرت نگاری کا اپنا ایک لطف ہے، آج کل ایک خوب صورت اور منفرد ناول لکھنے کا خواب دیکھ رہا ہوں

ارژنگ: کسی ادبی تحریک کا بھی کبھی حصہ رہی ہیں؟ کیا اہل قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہیے

افضل مراد: میں اردو زبان کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ادبی دبستانوں سے ادبی تحریکوں کو پڑھنے اور سمجھنے کی حد تک واقفیت رکھتا ہوں مگر ان پر کوئی ماہرانہ رائے نہیں دے سکتا۔۔۔۔بس اتنا جانتا ہوں کہ ادب زندگی کی نمائندگی کا فریضہ ادا کرتا ہے، انسان اور کائنات کے داخلی اور خارجی صورتوں کو بیان کرتا ہے،

فطرت کے مناظر سے آشنائی دیتا ہے
خوابوں سے دلربائی دیتا ہے

آتے اور جاتے زمانوں کے منظرنامے سامنے لاتا ہے، شعور عطا کرتا ہے زندگی سے انسان سے اور کائنات سے محبت کا درس دیتا ہے۔

ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ محبت سب سے بڑی تحریک ہیں اور اس کا حصہ ہیں، سیاسی پارٹیوں میں جب بھی جتنے بھی اہل قلم نے حصہ لیا وہ معاشرے میں علم وادب کے فروغ کا باعث بنے جہاں تک سیاست کی بات ہے تو یقیناً حصہ لینا چاہیئے اس پر لکھنا چاہیئے ۔۔۔۔سیاسی امور اور سیاست دان کے کردار پر تنقید کرتے ہوئے اپنی تخلیقی حیثیت کو برقرار رکھتے

CamScanner

ہوئے۔ یہ بھی سماجی تبدیلی کا ایک ٹول ہے اس سے صرف نظر کرنا زیادتی ہے۔

ارژنگ: کیا یہ تاثر درست ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جا ہے؟؟

افضل مراد: میڈیا کا کردار ہر دور میں بہت اہم رہا ہے پرنٹ میڈیا سے الیکٹونک میڈیا اور اب سوشل میڈیا ک کردار نمایاں ہے ہوا ہے لیکن آپ غور کریں یہ تمام میڈیا ز کو بنیاد فراہم کرنے والا اس کے تمام حوالے کتاب سے نکلیں گے ادب مذہب، قانون آئین سبھی کے مفاہیم کا کتاب کے حوالے سے مستند ٹھہرتا ہے۔۔۔کتاب کی اہمیت حیثیت اور مقام کو کبھی کم نہیں کیا جاسکتا۔

ہاں اگر مارکٹنگ کے حوالے سے بات کریں معیاری اور غیر معیاری تحریروں کا تقابل کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ لوگ اچھی کتابیں اچھا مواد چاہتے ہیں،۔۔۔اچھی کتاب کی مارکیٹ کبھی کم نہیں ہوئی۔۔۔بلکہ سوشل میڈیا آج کل شعر وادب کو فروغ دے رہا ہے۔۔۔نئی ٹیکنالوجی اب ای بک کے ذریعے اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔۔۔وقتی اُبال کو ہم رواج نہیں کہہ سکتے۔

ارژنگ: شعروادب کی ترویج میں مشاعرے کی کیا اہمیت اور کردار ہے؟

افضل مراد: مشاعرے کبھی ایک اچھی روایت اور اچھا مقام رکھتے تھے۔ اب بھی کہیں کہیں بہت اچھے مشاعرے ہوتے ہیں اچھی شاعری بڑی سنجیدگی سے سُنی جاتی ہے۔۔۔مگر مجموعی طور پر اب مشاعرے کم ورائٹی شو زیادہ ہورہے ہیں، مشاعرے جہاں سیکھنے سکھانے کا کام کرتے تھے اب وہ تفریح اور دیہاڑی کا سلسلہ بن چکے ہیں۔۔۔گروپ بندی اور لین دین اور پرفارمنس پر زیادہ توجہ دی جارہی ہے۔۔۔اب تازہ روایت یہ کہ آپ مشاعرہ پکڑیں تو مجھے بُلا لیں مجھے کوئی مشاعرہ مل جائے تو میں آپ کو زحمت دوں

ارژنگ: اپنی تصانیف کے بارے میں بتائیے؟ کونسی کتاب خود آپ کو سب سے زیادہ محبُوب ہے؟

افضل مراد: کتاب تو اولاد کی طرح ہوتی ہے، اس میں فرق رکھنا امتیاز رکھنا ناممکن ہے۔۔۔سبھی، لکھنے والے کو اہم لگتی ہیں۔

مجھے اپنی تخلیقی کتابیں اس لئے زیادہ پسند کہ اُن کو پڑھنے والوں نے بہت پسند کیا اپنی رائے دی۔ میرا حوصلہ اور اعتماد بڑھایا اور اپنی ذمہ داری اور سماجی مسائل پر شعوری کردار کی سند دی اس کی خوشی ہوتی ہے یہاں ایک بات کا اضافہ کروں کہ مجھے ڈرامہ لکھنے میں لطف آتا ہے۔۔کردار مکالمے منظر نامہ۔۔۔اُن کے تضادات پھر ایک مجموعی تاثر اور انجام تک آتے آتے ایک اچھا میسج پہنچاتے ہوئے تسکین ملتی ہے۔

ارژنگ: آپ نے زندگی کا ایک اہم حصہ اکادمی ادبیات پاکستان کے ساتھ گزارا ہے، یہ تجربہ کیسا رہا؟

افضل مراد: مجھے بچوں کو پڑھانے میں ایک خوشی اور تسکین کا پہلو ملتا تھا شام کو اخبار کے دفتر میں بچوں کی دنیا اور ادب وفکر کے صفحے کے ساتھ ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے اہل قلم کے ساتھ رابطوں میں اپنی مرضی اور مزاج کے دن گُزر رہے تھے،

اس دوران بلوچستان کے ادیبوں شاعروں اور دانشوروں نے ادبیات کے برانچ آفس کو فعال کرنے کے لئے مرکز سے مطالبہ کیا۔۔۔مجھے یاد پڑتا ہے کہ کراچی میں ادبیات کی جانب سے ہمارے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام کیا گیا تھا اُن دنوں نامور ادیب اور کالم نگار محترم نذیر ناجی چیئرمین ادبیات تھے وہ تقریب کے دوران پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے ہماری گفتگو سنتے رہے بعدازاں چائے پر بات چیت کے دوران انہوں نے مجھے ادبیات کوئٹہ برانچ کی ذمہ داری سنبھالنے کی آفر دی، لیکن ہم نے احتراماً انکار کردیا۔ بعدازاں بلوچستان کے اہل قلم نے مجھے منتخب کیا تو بچ نکلنے کی صورت نہیں بنی۔ میں نے اپنی ذمہ داری کو ایک مقصد کے تحت نبھایا اردو کے ساتھ ساتھ اپنی مادری زبانوں کے ادب کے فروغ کے لئے محدود وسائل میں مشاعرے مذاکرے سیمینارز منعقد کرائے، اہل قلم کے درمیاں رابطوں کو بڑھایا، تراجم کے ذریعے بلوچستان کے ادب کو باہر کی دنیا سے متعارف کرایا۔۔ادبیات کے افس کو اہل قلم کا رابطہ آفس بنایا۔۔۔خاص طور پر نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لئے یوتھ مشاعرے کی روایت کا آغاز کیا خواتین اہل قلم کی ایک بڑی تعداد متعارف ہوئی۔۔۔

برانچ افس کے بیشمار مسائل، ہیڈ آفس کی بیتوجہی اور آفیشل معاملات میں الجھانے اور بروقت فنڈز کی فراہمی میں رکاوٹوں کے باوجود ہم نے ایک جذبے کے ساتھ کام کیا۔۔۔میرے سٹوڈنٹ 19 گریڈ تک پہنچ گئے مگر ہمیں 17 گریڈ میں ریٹائرمنٹ نصیب ہوئی اس کے باوجود آج ادبیات کی اپنی بلڈنگ ہے اپنے وسائل ہیں۔ مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ میرے اکثر دوست اکادمی ادبیات کی بجائے مجھ ایک آدمی ابیات کہتے تھے

ارژنگ: تخلیقیت کیا ھے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتی ھیں؟

افضل مراد: تخلیقیت، ایک ایسا پیکر تراشنا ہے جو اپنے اندر باہر سے ہر زاویے سے مکمل ہو جس کو کس بھی اینگل سے دیکھیں تکمیلیت کا تاثر دے اس طرح تخلیق کے بہت سارے مظاہر ہیں بہت سارے

حوالے ہیں لیکن جب ادبی تخلیق کی بات ہو تو ایک اچھی تخلیق اپنے موضوع، مواد، اسلوب اور زبان کی تہہ داری اور گہرائی کے ساتھ ساتھ پڑھنے والے کی توجہ حاصل کرے اپنی انفرادیت قائم رکھ سکے (یاد رہے کہ یہاں میں پاپولر لٹریچر کی بات نہیں کر رہا)

تخلیقی ادب کسی بھی زبان میں زندہ رہنے والا ادب ہوتا ہے جو اپنے جغرافیے، تاریخ و تہذیب اور ثقافتی حوالوں کی نمائندہ کہلائی جاتی ہے

ارژنگ: کوئٹہ اور بلوچستان کی مجموعی فضا ادب کی تخلیق کے لیے کیسی ہے؟

افضل مراد: بلوچستان کی تاریخ شعری روایت سے جُڑی ہے روحانی سطح پر فارسی زبان کی قربت نے جو اثرات عطا کئے، اس کی وجہ سے علمی ادبی فضا سماجی سطح پر قبائل، زبانوں اور علاقوں میں پروان چڑھتی رہی۔۔۔۔لکھنے والے کی عزت اور اہمیت بہت زیادہ تھی اُسے بڑے بڑے فیصلوں میں بطور دانشور شامل کیا جاتا۔ اچھے شعر کے لئے تالیس نہیں بجتی تھیں اسے سنجیدگی سے سُنا جاتا تھا یہی شاعر کے لئے بڑی داد تھی۔ اس روایت کو سامنے رکھتے ہوئے آج بھی تخلیقی ادب لکھا رہا ہے۔۔۔۔زیادہ تر مزاحمتی ادب ہے مگر فنی عموز اور مواد کی حقیقی صورت پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔۔۔۔خاص طور پر مادری زبانوں میں شاندار ادب تخلیق ہو رہا ہے جو عصری تقاضوں کا منظرنامہ پیش کرتی ہے

ارژنگ: مرکز سے دوری کے سبب نظرانداز کیے جانے کا احساس تو کبھی نہیں ہوا؟

افضل مراد: مرکز کی اپنی ایک ذہنیت ہوتی ہے وہ ڈامونیٹ کرنے اپنی سُپرمیسی بنائے رکھنے کے لئے بہت سارے حیلے وسیلے کرتی ہے۔۔۔۔مگر ادبی اور تخلیقی سطح پر ہم نے اپنی راہ اپنائی ہے۔۔۔۔اپنے اردگرد سے جُڑ کر تحریریں سامنے آتی ہیں۔۔۔۔یہ یہ کہ ملکی سطح پر وہ پذیرائی نہیں ملتی۔۔۔۔برابری کی بنیاد پر اہمیت نہیں دی جاتی۔۔۔وہاں سے دس تو یہاں سے ایک بندہ۔۔۔۔یہی چل رہا ہے

ادبی ادارے خاص طور پر بلوچی اکیڈمی شاندار طریقے سے کام کر رہی ہے۔۔۔اس کے علاوہ پشتو اکیڈمی، براہوئی اکیڈمی اشاعتی سلسلے میں آگے ہیں۔ باقی چند تنظیمیں اپنے وسائل میں مشاعروں کا انعقاد کرتی ہیں۔ باقی دور دراز کے ادارے بھی متحرک ہیں، کتاب میلے کی روایت مستحکم ہو رہی ہے،

ارژنگ: کسی لکھاری کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے؟ یا اندرون سے؟

افضل مراد: اس سوال پر مجھے غالب کا شعر یاد آ رہا ہے

ہوئی مدت کہ غالب مرگیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پہ کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

کوئی بھی لکھنے والا اپنے اردگرد سے کٹ کر ہٹ کر کوئی بڑی تخلیق نہیں کرسکتا اس کا اندرون بھی بیرون سے جُڑا ہوتا ہے، اپنی ذات سے اپنے مشاہدے اور ادراک سے جوڑ کر زندگی کے معنی بنتے اور بگڑتے ہیں یہی اصل تحریک ادبی مواد کا سبب بناتا ہے۔

تب اپنے احساسات اور کرداروں کے ذریعے معاشرے کی مسائل کو اجاگر کرتا ہے بہتر زندگی کے خواب سامنے لاتا ہے، ایک اچھے اور روشن مستقبل کے راستوں کا تعین کرتا ہے۔۔۔۔جن معاشروں میں ادب رہنمائی کا فریضہ ادا کرتا ہے وہ معاشرے شاندار مستقبل پاتے ہیں

ارژنگ: ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثرانداز ہوتی ہیں؟

افضل مراد: یہ بات تو طے ہے کہ لکھنے والا اپنی تخلیق میں کہیں نہ کہیں موجود ہوتا ہے کسی احساس و تجربے کی صورت کسی کردار کی حیثیت سے کہیں راوی کی صورت میں، یہ تمام پہلو تخلیقی عناصر کے لئے مدد فراہم کرتے ہیں کہیں بیانیہ کی صورت کہیں کسی علامت میں کہیں میجک ریئلازم کی صورت۔۔۔اب لکھنے والے کی وسعت مطالعہ اور مشاہدہ مل کر ایک اچھی تخلیق کا باعث بنتے ہیں

ارژنگ: کیا کھویا کیا پایا؟

افضل مراد: زندگی بہت سارے عوامل کا مجموعہ ہے اس میں انسان کی سطح پر بہت سارے نشیب و فراز آتے ہیں بچپن جوانی اور اب تک کی زندگی میں بہت قریبی رشتوں کے کھو جانے کا غم ازلی دکھوں میں تبدیل ہو چکا ہے۔۔۔۔بہت سارے ناتکمیل خواب تعبیر سے محروم رہے ہیں، بہت ساری خواہشوں نے بیحد تڑپایا ہے۔۔۔۔بڑے بڑے عزائم ادھورے رہ گئے ہیں۔۔۔۔لیکن اگر بطور لکھاری پوچھیں تو کچھ بھی نہیں کھویا بلکہ بہت کچھ پایا ہے بہت کچھ جاننے کو ملا ہے۔ زندگی کی بیشمار پرتیں کھلی ہیں وہ وقت اور زمانے کی حقیقت کا ادراک ہوا ہے۔۔۔۔اور خاص طور پر اپنی ناسمجھی کی سمجھ آئی ہے، بہت کچھ جاننے کی تمنا جاگی ہے

لفظ و حرف کی یاری نے نفرت سے نفرت کی طاقت دی ہے اور محبت سے محبت کا شعور بخشا ہے۔

ارژنگ: آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟ مستقبل کے کیا منصوبے اور ارادے ہیں؟

افضل مراد: آج کل مطالعے پر زیادہ توجہ ہے۔ خاکہ نگاری کی کتاب تکمیل کے مراحل میں ہے کوئٹہ کی عوامی اردو کے مجموعے کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔ ایک شارٹ فلم مکمل کی ہے۔ جسے خود ڈائریکٹ کروں گا باقی صحت اور حالات سے مشروط ہے!!!

CamScanner

مدیرِ اعلیٰ ''الحمرا'' جناب شاہد علی خاں سے حسن عباسی کا مکالمہ

ارژنگ: آپ موجودہ اردو ادب کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

شاہد علی خاں: ادب میں نئے تجربات خوش آئند ہیں، لیکن اگر وہ اخلاقی اور فکری حدود سے تجاوز کریں تو ادب کا حسن متاثر ہوتا ہے۔ میری کوشش رہی ہے کہ ''الحمرا'' میں جدیدیت اور روایت کے درمیان متوازن راستہ اختیار کیا جائے۔

ارژنگ: ''الحمرا'' کو دیگر ادبی رسائل سے ممتاز بنانے والی خصوصیات کیا ہیں؟

شاہد علی خاں: ہم گروہ بندی سے بالاتر ہو کر ہر مکتبۂ فکر کے اہلِ قلم کو جگہ دیتے ہیں۔ معیاری مضامین، یادنگاری، شخصیات پر تحقیقی تحریریں اور ادب کے متنوع موضوعات ہماری شناخت ہیں۔

ارژنگ: آپ کے خیال میں ادبی رسائل کا معاشرے میں کیا کردار ہونا چاہیے؟

شاہد علی خاں: ادبی رسائل صرف تخلیقات شائع کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ فکری تربیت، تہذیبی شعور اور قومی شناخت کو مستحکم کرنے کا مؤثر وسیلہ بھی ہیں۔

ارژنگ: ایف سی کالج کے زمانے میں ادارت کے تجربے نے آپ کو کیا سکھایا؟

شاہد علی خاں: کالج میگزین ''فولیو'' کی ادارت نے مجھے نظم و ضبط، تحریر کی باریکیوں اور مختلف خیالات کو متوازن انداز میں پیش کرنے کا ہنر سکھایا، جو بعد میں بہت کام آیا۔

ارژنگ: نوجوان لکھنے والوں کو آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

شاہد علی خاں: مطالعہ کو اپنی زندگی کا لازمی حصہ بنائیں، زبان پر عبور حاصل کریں، روایت کا احترام کریں لیکن تخلیقی جرات بھی رکھیں، اور شہرت سے زیادہ معیاری ادب تخلیق کرنے کو اپنا مقصد بنائیں۔

ارژنگ: آپ کی نظر میں ایک کامیاب مدیر کی سب سے اہم خوبی کیا ہے؟

شاہد علی خاں: غیر جانب داری، معیار پر سمجھوتہ نہ کرنا، نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور ادب کی خدمت کو ذاتی مفادات پر ترجیح دینا ایک کامیاب مدیر کی بنیادی صفات ہیں۔

ارژنگ: آپ مستقبل میں ''الحمرا'' کو کس مقام پر دیکھنا چاہتے ہیں؟

شاہد علی خاں: میری خواہش ہے کہ ''الحمرا'' اردو زبان و ادب کا ایسا مستند حوالہ بنے جہاں دنیا بھر کے اہلِ قلم اپنی بہترین تخلیقات پیش کرنا باعثِ اعزاز سمجھیں اور یہ رسالہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک علمی سرمایہ ثابت ہو۔

❀❀❀

''آرزوئے ناتمام''

مجھے بس اتنا یقیں دلا دو
کہ جب میں صحرا کی خاک اُڑاتا ہوا
پہاڑوں کو کاٹ کر جوئے شیر لاؤں
تو اپنے تیشے سے خود ہی سر پھوڑ کر
مجھے خودکشی نہ کرنی پڑے

مجھے بس اتنا یقیں دلا دو
کہ جب تلک اُلجھنوں کے سارے
حصار کو توڑ کر
فصیلیں گرا کے ساری رُکاوٹوں کی
سفر کی ساری صعوبتوں کو شکست دے کر
میں واپس آؤں
تو تم مری منتظر رہو گی

شمیم آذر

❀

اک شہر تھا بسا ہوا خواب و خیال میں
گم ہو کے رہ گیا ہے کہیں ماہ و سال میں

گاؤں کی وہ ندی وہ درختوں کے سلسلے
مبہم سے کچھ نقوش خیالوں کے جال میں

جی چاہتا نہیں کہ طبیعت سنبھل سکے
کچھ ایسی لذتیں سی ہیں دل کے ملال میں

جس نے دیے ہیں زخم وہی پوچھتا بھی ہے
باقی ہے کتنا وقت ابھی اندمال میں

الزام کیسے دوں میں کسی اور کو بھلا
میں جب کہ خود شریک ہوں اپنے زوال میں

اس مسئلوں کے شہر میں ہر شے تھی حل طلب
میں خود بھی اک سوال تھا شہرِ سوال میں

کردار سب وہی ہیں اداکار مختلف
قوموں کی داستانِ عروج و زوال میں

کتنے تھے نیک لوگ، گنہگار کتنے تھے
تفریق اس کی کب ہوئی جنگ و جدال میں

دنیا تو جا چکی مہ و خورشید سے پرے
اُلجھے ہوئے ہیں آپ ستاروں کی چال میں

شمیم آذر

CS CamScanner

نامحرم

سیما پیروز/لاہور

سارے گاؤں میں بیدی اور فلک شیر کی شادی کی چرچا تھی۔ بات بھی تو بڑی انوکھی اور ناممکن تھی۔ کہاں فلک شیر ملک فتح شیر کا خوبصورت اور لاڈلا تھا۔ ملک فتح شیر چک چوراسی کا مالک اور کہاں بیدی ساتھ والے گاؤں کے چند بیگھوں کے مالک معمولی کسان کی بیٹی۔

دنیاوی جاہ وحشم تو بیدی کے پاس نہیں تھا پر حسن کی دولت سے مالا مال تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو بڑی فرصت میں بنایا تھا۔ اونچی لمبی، مکھن کے پیڑے جیسی گوری، چھریری بادامی آنکھیں ان پر گھنی پلکوں کا سایہ، گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ اور چودھویں کے چاند جیسا چہرہ۔ آنکھ اُٹھا کر کسی کو دیکھ لیتی تو وہ مسمرائز ہو جاتا۔ پہروں دیکھتے رہو تو بھوک نہ مٹے۔

بیدی اپنے سات بہن بھائیوں میں چھٹے نمبر پر تھی۔ سب سے بڑا بھائی تھا اور پھر چار بیٹیوں کے بعد دوسرے بیٹے کی آس میں جب بیدی پیدا ہوئی تو کرم دین کے گھر صف ماتم بچھ گئی۔ ان دنوں شہر سے بیدی کے ماموں اور ممانی آئے ہوئے تھے۔ اتفاق سے وہ بے اولاد تھے۔ واپس جاتے وقت وہ بڑے چاؤ اور پیار سے بیدی کو ساتھ لے گئے۔ بیدی کے گھر والوں نے ہنسی خوشی اسے روانہ کر دیا۔ ماموں ممانی کو تو گویا دو جہانوں کی دولت مل گئی تھی۔ انہوں نے بیدی کو اپنی آنکھوں کا تارا بنا کر رکھا۔ ماموں شہر میں کسی دفتر میں کلرک تھا۔ کم آمدنی کے باوجود انہوں نے بیدی کو بڑے ناز ونعم سے پالا اور میٹرک تک تعلیم بھی دلوائی۔

کچھ تو بیدی کو اللہ تعالیٰ نے حسین بنایا تھا۔ کچھ اس کا شہری لباس بول چال اور رکھ رکھاؤ۔ وہ گاؤں کی لڑکیوں میں سب سے الگ دِکھتی تھی۔ گاؤں میں جس طرف سے گزر جاتی لڑکے اپنا دل پکڑ کر بیٹھ جاتے۔ آہیں بھرتے۔ پر بیدی کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ویسے بھی گاؤں کے گنوار لڑکے اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔

بیدی اپنے بڑے بھائی کی شادی پر گاؤں آئی ہوئی تھی۔ اس روز سب لڑکیاں گھڑولی بھرنے جا رہی تھیں۔ (گھڑولی بھرنا گاؤں کی ایک رسم ہے۔ بہنیں اور بھابھیاں سات کنوؤں کا پانی بھر کر لاتی ہیں۔ اس پانی سے دولہا کو نہلاتے ہیں)

ساری لڑکیاں ہنستی کھیلتی اپنے دھیان میں جا رہی تھیں کہ اچانک ایک گھوڑ سوار سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا۔ اگر بیدی اپنی سہیلی شادو کا بازو پکڑ کر اسے کھینچ نہ لیتی تو وہ یقیناً گھوڑے کے نیچے آ جاتی۔ بیدی اور شادو دونوں زمین پر گر گئیں۔ ان کے گھڑے بھی ٹوٹ گئے اور کپڑے بھی مٹی میں لت پت ہو گئے۔ بیدی تیزی سے غصے میں بھری اُٹھ کھڑی ہوئی اور گھوڑ سوار کے گلے پڑ گئی۔

''آنکھیں ہیں کہ کول ڈوڈے! تم بڑے لوگ دوسروں کو انسان ہی نہیں سمجھتے۔'' گھوڑ سوار ٹکر ٹکر بیدی کی شکل دیکھے جا رہا تھا۔

''سانپ کیوں سونگھ گیا ہے؟ بولتے کیوں نہیں ہو! کچھ تو منہ سے پھوٹو۔''

''تم بولنے کا موقع دو گی تو میں بولوں گا۔ تمہاری زبان تو قینچی کی طرح چل رہی ہے۔''

''کیوں؟ میں نے تمہارا گلا دبایا ہوا ہے؟'' بیدی تنک کر بولی۔

''دیکھو! تم جو کوئی بھی ہو فالتو باتیں مت کرو۔ غلطی تم لوگوں کی بھی ہے۔ تم لوگوں کو کس نے کہا تھا کہ آگے پیچھے دیکھے بغیر سڑک کے عین درمیان خرمستیاں کرتی چلو۔''

''کیوں؟ سڑک تمہارے باپ کی ہے۔''

''بہت بدتمیز ہو تم!! تمہیں کسی نے تمیز نہیں سکھائی۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میں کون ہوں۔'' فلک شیر کا انداز غرور لیے ہوئے تھا۔

''تم جو کوئی بھی ہو نہایت بیہودہ انسان ہو۔'' بیدی نے دوبدو جواب دیا۔

''بیدی اللہ کا واسطہ چپ کرو۔ یہ چودھری صاحب کا مہمان ہے۔'' اس کی سہیلیوں نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی۔

''تو ہوا کرے کسی کا بھی مہمان۔ ہم کوئی اس کا دیا کھاتے ہیں۔''

''شرافت کا زمانہ نہیں۔ میں نے بڑی غلطی کی جو تم لوگوں کو پوچھنے کھڑا ہو گیا کہ کوئی چوٹ تو نہیں لگی اور تم ہو کہ خوامخواہ سر پر چڑھے جا رہی ہو۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ پاؤں کی دھول پاؤں کے نیچے ہی اچھی لگتی ہے۔''

''تمہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ پاؤں کی دھول جب اُڑتی ہے تو سر کی طرف آتی ہے۔''

لڑکیاں بیدی کو گھسیٹ کر لے گئیں ورنہ جانے کب تک لڑائی جاری رہتی۔ فلک شیر غصے میں بھرا ہوا اپنے دوست ارشد کے پاس پہنچا اور اسے شکایت لگائی۔

''یار تیرے گاؤں کی لڑکیاں بہت بدتمیز ہیں۔ میرے گاؤں کی ہوتیں تو شام سے پہلے عقل ٹھکانے لگا دیتا۔''

''کیا ہوا؟'' فلک شیر نے ارشد کو ساری بات

بتائی تو وہ دیر تک ہنستا رہا۔

''تم ہنس رہے ہو اور میرا خون کھول رہا ہے۔''

گھر جا کر بھی فلک شیر غصے سے کھولتا رہا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بیدی کا منہ توڑ دیتا۔ اگر لڑکا ہوتی تو یقیناً خون خرابہ ہو جاتا۔ رات کو بھی اسے ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ جب کئی روز اس کی یہی کیفیت رہی تو اس نے ٹھنڈے دل سے غور کیا اور خود سے سوال کیا ''کیوں بھئی ملکا! یہ غصہ ہی ہے یا کچھ اور بات ہے۔'' جواب سے وہ پریشان ہو گیا۔ فلک شیر نے کئی چکر اوپر تلے ارشد کے گاؤں کے لگائے۔ آخر ایک روز ارشد نے کہہ ہی دیا۔

''کیوں فلک شیر آج کل میری محبت کچھ زیادہ ہی نہیں جاگ پڑی۔ خیر تو ہے؟''

''ایک تو میں تمہیں ملنے آتا ہوں اور تم مجھ پر شک کر رہے ہو؟''

''نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں۔ تم سو بار میرے پاس آؤ۔ رات بھی میرے پاس ٹھہرو پر مجھے ایک بات کا شک نہیں بلکہ یقین ہے'' ارشد شرارت سے فلک شیر کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''مجھے ایک بات سچ سچ بتانا کہیں بیدی سے ملنے کے لیے پھیرے تو نہیں لگ رہے؟'' فلک شیر بے بسی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

ارشد نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ''دیکھا میں نے کیسے تیرے دل کا چور پکڑا ہے۔ تم لاکھ مجھ سے چھپاؤ پر جناب ہم تو اُڑتی چڑیا کے پر گننے والوں میں سے ہیں۔''

فلک شیر نے بے تاب ہو کر اپنا دل کھول کر ارشد کے سامنے رکھ دیا۔ ''یار میں کیا کروں مجھے دن رات اس کا خیال بے چین رکھتا ہے۔ آنکھیں بند کرتا ہوں تو اس کی صورت آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے۔''

''تو اب تم کیا چاہتے ہو؟''

''مجھے خود کو سمجھ نہیں آ رہی۔ پہلے تو کبھی میرے ساتھ ایسے نہیں ہوا۔ تمہیں تو پتہ ہی ہے۔ کالج میں کتنی لڑکیاں میرے آگے پیچھے پھرا کرتی تھیں۔ میں نے کبھی کسی کو گھاس نہیں ڈالی تھی۔ تم بس مجھے اس سے ایک دفعہ ملوا دو۔ میں اسے دل بھر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔ فلک شیر نے بے تابی سے کہا۔

''دیکھو! فلک شیر میں تمہیں ایک بات صاف صاف بتا دوں۔ بے شک بیدی کا باپ ایک معمولی زمیندار ہے پر وہ لوگ بڑے شریف اور غیرت والے ہیں۔ ایسی ویسی کوئی بات وہ برداشت نہیں کر سکیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیدی ہمارے گاؤں کی سب سے خوبصورت اور سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو سب سے پہلے میں اس سے شادی کرتا لیکن میں نے شروع میں ہی دل کو سمجھا لیا تھا۔ ایک تو بچپن سے اپنی کزن سے میری منگنی ہو چکی ہے۔ دوسرے وہ ہمارے برابر کے نہیں ہیں۔ تیرے گھر والے بھی اس رشتے پر کبھی رضامند نہیں ہوں گے۔ میں کہتا ہوں میری طرح تو بھی دل کو سمجھا لے۔ جو راستہ منزل کی طرف نہ جاتا ہو وہاں سے پلٹ آنا ہی عقلمندی ہے۔'' ارشد نے فلک شیر کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''نہیں ارشد! میں اب اس راستے سے واپس نہیں پلٹ سکتا۔'' اس کے لہجے میں عزم تھا۔

''اچھی طرح سوچ لے بڑے ملک صاحب تیری شادی بیدی کے ساتھ کبھی نہیں کریں گے۔''

''دل کے رشتوں میں سوچ کیسی۔ محبت پلاننگ سے نہیں ہوتی۔ یہ تو قدرت کا وہ انمول تحفہ ہے جس پر انسان کو کوئی اختیار نہیں۔ محبت ہونے کے لیے بس ایک لمحہ کافی ہوتا ہے اور میں بس اس ایک لمحے کی گرفت میں آ گیا ہوں۔''

''کہیں تم دل لگی کو تو دل کا روگ نہیں سمجھ بیٹھے۔''

''تم نہیں سمجھو گے۔ تم نے محبت کی ہی نہیں تو پھر تم میرے جذبات کا کیسے اندازہ لگا سکتے ہو۔ چلو سب باتیں جانے دو۔ بس ایک بات یاد رکھو میں تمہیں اب اس وقت ملوں گا جب بیدی کو تمہاری بھابھی بنا لوں گا۔'' فلک شیر نے ارشد کا ہاتھ پوری قوت سے دبا کر عہد کیا۔

فلک شیر سب بہن بھائیوں سے چھوٹا اور والدین کا سب سے لاڈلا تھا۔ بہنیں اس کے واری صدقے جاتیں تو بھابھیوں کا وہ دُلارا دیور تھا۔ کئی دنوں سے سارے گھر کو اس کی چپ نے پریشان کیا ہوا تھا۔ جس دن یہ پتہ چلا کہ فلک شیر کا دل جاٹوں کے گاؤں کی ایک معمولی سی لڑکی پر آ گیا ہے بڑے ملک صاحب نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور اس کی ماں کو آواز دے کے کہنے لگے ''ملکانی! تم نے کچھ سنا؟ مبارک ہو تمہارا بیٹا جوان ہو گیا ہے۔ اب اس کے لیے اپنے خاندان میں کوئی لڑکی ڈھونڈو۔''

''لڑکی ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنی بڑی بہو کی بہن صاحباں جو ہے۔ خوبصورت سلیقہ شعار اور پانچ جماعتیں پاس ہے۔ میرے فلک شیر اور اس کی جوڑی چاند سورج کی جوڑی ہوگی۔''

جب فلک شیر سے پوچھا گیا تو اس نے اس رشتے سے صاف انکار کر دیا۔ ''میں شادی کروں گا تو صرف بیدی کے ساتھ۔'' اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''لے جھلا نہ ہو تو۔ شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر تمہیں بیدی اتنی پسند آ گئی ہے تو ایک بار اشارہ کر شام سے پہلے اُٹھوا لیں گے۔ مہینہ دو مہینہ جتنا عرصہ تیرا دل چاہے رکھنا۔ جب دل بھر جائے گا واپس چھوڑ آئیں گے۔'' بڑے ملک صاحب نے فلک شیر کے کندھے پر ہاتھ مار کے ایسے کہا جیسے بڑی معمولی بات ہو۔

''ابا جی!'' فلک شیر کی آواز غصے سے بند ہو گئی۔

''کیا ہوا پتر؟ میں نے کچھ غلط کہا۔ جوانی میں سارے ہی لڑکے آنکھ مٹکا کرتے ہیں۔ عشق اور شکار تو مردوں کے گہنے ہوتے ہیں۔ پر یہ نہیں ہو سکتا کہ

CamScanner

پاؤں کی جوتی ہم سر پر رکھ لیں۔ کہاں ہم اور کہاں وہ کمی کمین۔ کچھ عقل کر پتر۔''

''ابا جی وہ کمی کمین نہیں ہیں۔ بے شک وہ تھوڑی سی زمین کے مالک ہیں پر کسی کے مزارے نہیں ہیں۔ ویسے بھی وہ ذات کے جاٹ ہیں۔''

''ذات کے جاٹ ہونے سے وہ گاؤں کے مالک تو نہیں بن گئے۔ نہ ہی وہ ہمارے برابر کے ہو گئے ہیں۔ میں نے جو بات کہی ہے اس پر عمل کرو۔ تیرا شوق بھی پورا ہو جائے گا اور ہماری بے عزتی بھی نہیں ہوگی۔''

''ابا جی! میں بیدی کے بارے میں اس طرح کی گھٹیا باتیں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے اس کے ساتھ محبت کی ہے اور وہ میری عزت ہے۔ اسے میں سہروں اور باجوں کے ساتھ پورے مان تران سے بیاہ کر لاؤں گا۔ اگر کسی نے بیدی یا اس کے گھر والوں کو ذرا سا بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو وہ میری لاش ہی دیکھے گا۔''

آخر کار بڑے جتنوں سے بیدی اور فلک شیر کی شادی ہو گئی۔ فلک شیر نے بیدی کے گھر والوں کو بڑی مشکل سے منایا تھا۔ وہ مان کے ہی نہیں دے رہے تھے۔ بیدی کے باپ نے فلک شیر کو بڑے طریقے سے انکار کیا اور سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ بڑے لوگوں کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کیا پتہ وہ اپنی ہتک محسوس کریں۔

''چھوٹے ملک جی کہاں آپ لوگ اور کہاں ہم غریب لوگ یہ بے جوڑ شادی کیسے ہو سکتی ہے۔ آپ کو ایک سے ایک امیر اور خاندانی لڑکی مل جائے گی۔ ہمارے اوپر رحم کریں۔''

''جب ہمیں آپ کی غریبی پر کوئی اعتراض نہیں تو آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔'' فلک شیر نے تسلی دی۔

''ملک جی کبھی مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا ہے۔''

''میں امیری غریبی اور بڑے چھوٹے کو نہیں مانتا۔ سب انسان برابر ہیں۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ آپ کی بیٹی کو میں ہمیشہ خوش رکھوں گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔''

سارے گاؤں والوں کا بھی یہی خیال تھا کہ شادی چند مہینوں سے زیادہ نہیں چل سکے گی۔ بیدی کو یہ ڈر تھا کہ فلک شیر نے اس سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے شادی کا ڈھونگ رچایا ہے۔ بڑے ملک صاحب کو تو سو فیصد یقین تھا کہ جب دل بھر جائے گا تو پرانی جوتی کی طرح اُتار پھینکے گا۔ ابھی کر لے اپنی ضد پوری۔''

شادی کی رات بیدی فلک شیر کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔

''میں جانتی ہوں آپ نے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے مجھ سے شادی کی ہے۔ میں ساری زندگی آپ کی باندی بن کر گزار دوں گی۔ آپ کا جہاں دل چاہے اپنے برابر کے لوگوں میں شادی کر لیں۔ پر مجھے طلاق کا داغ مت لگانا۔ میں اور میرے ماں باپ یہ نہ سہہ سکیں گے۔'' اس کی ہرنی جیسی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو تواتر سے گر رہے تھے۔

فلک شیر نے اس کے بندھے ہوئے ہاتھ بڑے پیار سے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے۔

''پاگل نہ ہو تو۔ یہ باتیں تیرے دماغ میں آئیں کیسے؟ اتنی مشکلوں سے یہ شادی میں نے اس لیے کی ہے۔ تیرے بغیر تو میں ایک پل بھی نہیں رہ سکتا۔ تیری جگہ میرے قدموں میں نہیں میرے دل میں ہے۔''

بیدی اور فلک شیر کی شادی کے چالیس برس کسی سہانے خواب کی طرح بیت گئے۔ بیدی نے خدمت اور اچھے اخلاق سے ہر کسی کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ کچھ قدرت نے بھی اس کی مدد کی۔ فلک شیر کے دو بھائی بے اولاد تھے۔ حالانکہ دونوں نے دو دو شادیاں کی تھیں۔ باقی بھائیوں کی اولاد تو تھی پر ان کی بیٹیاں زیادہ اور بیٹا ایک ایک تھا۔ ملک صاحب کو اس بات کا بڑا صدمہ تھا کہ ان کے اپنے تو چھ بیٹے تھے کم از کم پوتے بھی چھ تو ضرور ہونے چاہیے تھے۔ بیدی کو اللہ تعالیٰ نے اوپر تلے پانچ بیٹوں کو ماں بنا دیا۔ بیٹے بھی شہزادوں جیسے حسین۔ ماں کی طرح گورے چٹے اور باپ کی طرح شہینہ جوان۔ ملک صاحب پھولے نہیں سماتے تھے۔ بیدی فلک شیر کے دل کی رانی تو تھی ہی۔ ساس، سسر، جیٹھ، جیٹھانیاں سب اس کے گن گاتے تھے۔ حتیٰ کہ نوکر چاکر بھی اس کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے۔ کچھ خدمت اور کچھ محبت کے بل پر بیدی نے میدان جیت لیا تھا۔ اتنی بڑی فاتح بن کے بھی اس میں ذرا جتنا غرور نہیں تھا۔ وہی حلیمی وہی لپٹی ہوئی طبیعت۔ ہمہ وقت سب کی خدمت کے لیے تیار۔ سارے گھر کی وہ کار مختار تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بڑے بھاگ لگائے تھے۔ لوگ اپنی بیٹیوں کو اس جیسے نصیبوں کی دعا دیتے تھے۔ بیدی کے سب بیٹے شادی شدہ تھے۔ پوتے پوتیوں کے درمیان بیٹھی ہوئی وہ چھپ سی جاتی تھی۔

فلک شیر کچھ عرصے سے کمزور سا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا وزن بڑی تیزی سے گھٹ رہا تھا۔ بظاہر تو نہ کوئی کھانسی نہ بخار نہ کہیں درد۔ اللہ جانے کیا روگ تھا۔ کئی ڈاکٹروں حکیموں کو دکھا چکے تھے۔ کوئی بیماری ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بیدی فکر اور پریشانی سے مرجھا کر رہ گئی تھی۔

''جھلی نہ ہو تو۔ کیوں فکر کرتی ہو۔ میں بھلا چنگا ہوں۔ معمول کے مطابق اپنے سارے کام کرتا ہوں۔ کھاتا پیتا ہوں۔ اچھا ہے ذرا سمارٹ ہو گیا ہوں۔ تم ہی تو ہر وقت مجھے موٹا ہونے کے طعنے دیتی رہتی تھی۔ اتنے ڈاکٹروں کو دکھا چکے ہیں اگر خدانخواستہ کوئی بیماری ہوتی تو وہ کیوں چھپاتے۔'' بظاہر بیدی مطمئن ہو گئی۔ پر نہ جانے کیوں اسے وہم ہو گیا تھا کہ

فلک شیر کو کوئی بیماری ہے۔ وہ ہر نماز کے بعد اس کی لمبی زندگی کی دعائیں مانگتی۔

"یا اللہ! میری زندگی بھی فلک شیر کو لگا دے۔ میں اس کے ہاتھوں میں جاؤں۔"

کچھ دنوں سے فلک شیر ٹھوس غذا کھانے میں دقت محسوس کر رہا تھا۔ بیدی اور ملک صاحب اسے ایک مشہور ہاسپٹل لے گئے۔ انہوں نے فلک شیر کو داخل کر لیا اور ٹسٹ شروع ہو گئے اور پھر قیامت کی گھڑی کی آن پہنچی۔ فلک شیر کو کینسر ڈائیگنوز ہوا تھا اور وہ اتنا پھیل چکا تھا کہ مزید کوئی علاج کرنا بے سود تھا۔ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ دو تین ہفتوں کا مہمان تھا۔ فلک شیر کو اپنی بیماری کے بارے میں پتہ چل چکا تھا۔ اس کے اصرار پر اسے گھر لے آئے تھے۔ اسے دیکھ کر بیدی کے آنسو اندر ہی اندر گرتے رہتے۔ پر وہ اس کے سامنے بڑے حوصلے میں رہتی اور اسے تسلیاں دیتی۔ "آپ ان شاء اللہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ یہ ڈاکٹر سے بڑے تو نہیں ہیں۔"

بڑے ملک صاحب اور فلک شیر کے بھائیوں کے درمیان کھچڑی میں پک رہی تھی۔ "کہیں فلک شیر کی وفات کے بعد بیدی کے حصے کی زمین غیروں میں نہ چلی جائے۔ بھائیوں کو تو پکا یقین تھا کہ بیدی اپنا حصہ یقیناً اپنے غریب بھائیوں کو دے گی۔ جب بھی وہ اکٹھے ہوتے اس بات پر غور و فکر ہوتا اور مختلف ترکیبیں سوچی جاتیں۔

فلک شیر نے ایک آدھ بار احتجاج کیا "ابا جی! بیدی ایسی نہیں ہے۔ اُس نے زمین لے کر کدھر جانا ہے۔ اس کا گھر یہی ہے۔ بچے ہیں پوری زندگی آپ نے کبھی اسے کسی بھی قسم کا لالچ کرتے دیکھا۔ نہ ہی اس کے گھر والے اس قسم کے لوگ ہیں وہ بڑے خوددار لوگ ہیں۔"

"سنیں پتر تمہیں نہیں پتہ عورتوں کو ہمیشہ بھائیوں سے بڑا پیار ہوتا ہے۔ ہم نے تو کئی قصے سن رکھے ہیں۔ ایک واقعہ تو بڑا مشہور ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں ایک عورت کا شوہر، بیٹا اور بھائی تینوں پکڑے گئے۔ جرم ثابت ہو گیا۔ سزا سنانے سے پہلے انگریز جج نے عورت سے کہا مجھے تم پر رحم آ رہا ہے۔ تم تینوں میں سے کسی ایک کو سزائے موت سے بچا سکتی ہو۔ عورت نے فوراً کہا جج صاحب میرے بھائی کو آزاد کر دیں۔"

اس روز فلک شیر کی طبیعت قدرے بہتر لگ رہی تھی۔ کمرے میں بیدی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

"بیدی! تمہیں مجھ سے اگر کوئی تکلیف پہنچی ہو تو مجھے معاف کر دینا۔ میں نے زندگی بھر اپنی طرف سے تو تمہیں خوش رکھنے کی پوری کوشش کی۔" فلک شیر نے بیدی کا ہاتھ پکڑ کر اس سے پوچھا۔

"یہ آپ کس طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ نے مجھے فرش سے اُٹھا کر عرش پر بٹھا دیا۔ میں تو اس لائق نہیں تھی۔ یہ سب باتیں تو مجھے آپ سے پوچھنی چاہیے تھی۔" بیدی زارو قطار رونے لگ پڑی۔ فلک شیر کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے بیدی نے فلک شیر کے آنسو اپنے دوپٹے کے پلو میں قیمتی موتیوں کی طرح سنبھال لیے۔

"فلک شیر آپ نے میرے ساتھ اچھی نہیں کی۔ مجھے بیچ راستے میں چھوڑے جا رہے ہیں۔ مجھے تو آپ کے بغیر جینے کی عادت ہی نہیں ہے۔ اللہ سے دعا کریں کہ وہ مجھے بھی ساتھ ہی اُٹھا لے۔" بیوی کی ہچکی بندھ گئی۔

مغرب کے بعد بڑے ملک صاحب فلک شیر کے کمرے میں آئے اور آتے ہی سب کو باہر نکال دیا۔

"آپ سب لوگ باہر جائیں ہم نے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔ کتنی دیر تک بند کمرے میں خدا جانے کیا کھچڑی پکتی رہی۔ بیدی کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کی دنیا لٹ رہی تھی۔ اس کا فلک شیر جا رہا تھا۔ اس کی جیٹھانیوں کو باتیں سننے کا بڑا چسکا تھا۔ انہوں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح بند کمرے کے فیصلوں کا ان کو کچھ پتہ چلے۔ پر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

ساری رات فلک شیر کی طبیعت بے حد خراب رہی۔ بیدی ساری رات اس کے پلنگ کی پٹی سے لگی بیٹھی رہی۔ اللہ تعالیٰ سے اس کے لیے دُعائیں کرتی اور روتی رہی۔ ایک فلم ساری رات اس کی آنکھوں کے آگے چلتی رہی۔ فلک شیر کا ملنا، شادی، اس کی بے پایاں محبت۔ یا اللہ میں اس کی جدائی کیسے سہن کروں گی۔ فجر کی اذانوں کے بعد فلک شیر ایسے سکون سے سویا جیسے اسے کوئی روگ نہ ہو۔ بیدی بہت خوش تھی۔

"شاید اللہ تعالیٰ نے میری دُعائیں سن لی ہیں۔"

دوپہر کو اچانک ہی فلک شیر کی حالت بگڑ گئی۔ سارے گھر والے اس کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ اس کا آخری وقت آ پہنچا تھا۔ فلک شیر نے بیدی اور بڑے ملک صاحب کو اپنے قریب بلایا اور بیدی کے کان میں نہ جانے کیا کہا۔ جسے سنتے ہی بیدی کو ایسے لگا جیسے کسی جادوگر کی پھونک سے سارا ماحول پتھرا گیا ہو۔ وہ خود بھی پتھر کی بن گئی ہو۔ وقت کی رفتار جیسے تھم سی گئی تھی۔ حتیٰ کہ جب فلک شیر نے آخری سانس لیا تو وہ اسی طرح ساکت و جامد بیٹھی رہی۔ سب کہہ رہے تھے اس کو رُلاؤ۔ اسے صدمے سے سکتہ ہو گیا ہے۔ بیدی کوئی اس کے کان میں چیخ رہا تھا۔ بیدی دیکھو تمہارا فلک شیر تمہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ رو لو...... بیدی رو لو۔ وہ اس طرح کی سنگی مجسمے کی طرح بیٹھی خلاؤں میں گھور رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ فلک شیر کی موت پر وہ کس ناطے سے روئے طلاق کے بعد تو وہ اس کے لیے نامحرم ہو گیا تھا۔

بابا جی

تسنیم کوثر/لاہور

بڑی دیر سے میں آئینے کے سامنے کھڑا ہوں۔ بہت غور سے اپنے آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ چہرے پہ پڑی ہوئی سلوٹوں کو گن رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ تہمینہ کے آنے سے پہلے بھی میرے چہرے پر اتنی ہی سلوٹیں تھیں۔ ذکیہ کی زندگی میں بھی اتنی ہی شکنیں تھیں یا شاید کچھ کم مگر ذکیہ نے کبھی مجھے اس کا احساس نہیں دلایا تھا۔ میری اور ذکیہ کی ازدواجی زندگی بہت مثالی تو نہ تھی مگر خوشگوار گزر رہی تھی۔ ہم دونوں ملازمت کرتے تھے۔ دونوں کماتے اور مل کر گھر چلاتے تھے۔ وہ میری عزت کرتی تھی اور میں اس کی قدر کرتا تھا حالانکہ ہم دونوں کے مزاج و عادات میں بہت تضاد تھا۔ میں علم و ادب کا پرستار تھا اور ذکیہ فنون لطیفہ سے دور بھاگتی تھی۔ اسے اچھے کپڑوں اور زیورات کا شوق تھا جبکہ میں کتابوں کا رسیا تھا۔ ہم دونوں جب بھی کہیں جاتے، اکٹھے گھومتے پھرتے زندگی کا لطف اٹھاتے مگر خریداری کے مرحلے پر ہماری راہیں جدا ہو جاتی تھیں۔ نہ میں نے اسے روکا اور نہ ہی اس نے کبھی مجھے ٹوکا۔ ایک دوسرے کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ہم ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے تھے اور اب ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ گئے تھے۔ ہمارے دونوں بیٹے پردیس جا بسے تھے۔ وہ اپنی اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس پاکستان آ تو گئے تھے مگر انہیں پاکستان کی دو نمبریاں پسند نہیں آئی تھیں۔ دراصل ہم دونوں میاں بیوی بہت وضع دار اور ایماندار تھے۔ ہمارے بچوں کو بھی ہم سے وراثت میں یہی چیزیں ملی تھیں۔

بڑا بیٹا سمیر کمپیوٹر کی اعلیٰ تعلیم مکمل کر کے جب پاکستان آیا تو اسے ایک نامور کمپنی نے ملازمت کی آفر دی۔ پیکج بہت اچھا تھا۔ سمیر نے مجھ سے مشورہ کیا اور کمپنی جوائن کر لی مگر وہ یہ ملازمت جاری نہ رکھ سکا کہ کمپنی اس کے اصولوں سے ٹکرانے لگی تھی۔ سادہ پیپرز پر دستخط کرنا اسے منظور نہ تھا۔ کمپنی ٹیکس بچانے کو واؤچرز میں گڑبڑ کرنا چاہتی تھی اور یہی بات سمیر کو سیخ پا کر جاتی تھی سو وہ زیادہ دیر اُن کے ساتھ نہ چل سکا اور استعفیٰ دے کر واپس وہیں چلا گیا، جہاں اس نے اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔ میں نے اسے روکنا چاہا مگر اس نے دلائل دیتے ہوئے کہا پاپا! میں کافروں کے دیس میں خوش ہوں کہ وہاں ملاوٹ نہیں، دھوکا نہیں، جھوٹ نہیں جبکہ میرے دیس میں ان صفات کے بنا کچھ بھی ممکن نہیں۔ مجھے اپنے وطن سے بہت پیار ہے پاپا جی مگر میں اپنے وطن کے باسیوں کے ساتھ چل نہیں سکتا۔ آپ نے میرے بارے میں جو سوچا، وہ میں نے کیا۔ آپ نے میری تعلیم کا جو خواب دیکھا، میں نے اسے پورا کیا۔ میں آپ کا اور آپ کی محبت کا احسان نہیں چکا سکتا پاپا جی مگر میں یہاں رہ کر دو نمبریاں نہیں کر سکتا۔ آپ نے حق حلال کی کمائی سے ہمیں پڑھایا۔ امی جی نے ہمیں نیک نیتی کا درس دیا، ایمانداری سکھائی۔ اپنی انہی محبتوں کا پاس رکھتے ہوئے میں پاکستان چھوڑنا چاہتا ہوں تاکہ کہیں انجانے میں مجھ سے کچھ ایسا سرزد نہ ہو جائے کہ میں آپ سے اور اپنے وطن سے آنکھیں نہ ملا سکوں، کہتا تو سچ تھا سمیر، میں نے دل ہی دل میں تائید کی۔

میں نے اپنے دورِ ملازمت میں سرکاری ملازموں کی ہٹ دھرمیاں دیکھ رکھی تھیں اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے گھپلے بھی۔ این جی اوز کی ہیرا پھیریاں بھی میری نظر میں تھیں، جہاں انسانی حقوق کے ادارے ڈالروں میں فنڈ وصول کر کے روپوں میں تنخواہیں بانٹتے دیکھے گئے تھے۔ انسانی حقوق کی حق تلفیاں کرتے پائے گئے تھے۔ ہم سرکاری ملازم ہوتے ہوئے اچھے عہدوں پر فائز ہو کر بھی اپنے ماتحت اہلکاروں سے پھڈا نہیں کر سکتے تھے۔ خود میرے ماتحت ایک مالی نے ہلکی سی سرزنش کرنے پر مجھ پہ کیس کر دیا تھا اور مہینوں عدالتوں کے چکر لگوائے تھے۔ سو میں نے اور ذکیہ نے دل پہ پتھر رکھا اور اپنے بیٹے کو کافروں کے دیس کو سونپ دیا۔ اب سمیر سال میں ایک دو بار چکر لگا لیتا تھا۔ ہم سے ملنے آ جاتا تھا اور کبھی ہم اس کے پاس چلے جاتے تھے۔ سمیر کی شادی ہم نے پاکستان میں کی تھی۔ اچھی فیملی تھی۔ اچھی لڑکی تھی۔ دونوں خوش باش تھے اور ہمارے قدردان تھے۔

دوسرا بیٹا شاہ میر ایک کامیاب سرجن بن گیا تھا لیکن بھائی کو پیش آنے والی مشکلات کو دیکھتے ہوئے اس نے پاکستان واپس آنے کا سوچا ہی نہیں اور اپنا مستقبل بدیشوں سے جوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ عمدہ معالج تھا۔ پاکستان آتا تو بہت سوں کا بھلا ہوتا مگر ہماری دی ہوئی ایمانداری کی گھٹی نے اپنے دیس کے باسیوں سے اس کا دل کھٹا کر دیا تھا۔ سو وہ بھی وہیں سیٹل ہو گیا۔ اسے وہاں ایک پاکستانی فیملی کی لڑکی پسند آ گئی تھی۔ اس نے مجھے اور ذکیہ کو اپنے پاس بلوایا اور ہماری رضامندی کے ساتھ اسے بیاہ لایا۔ سمیر کی شادی پر تو ہم نے خوب رونق لگائی تھی۔ عزیز و اقارب بھی جمع کیے تھے مگر شاہ میر کی شادی میں نہ مہندی نہ شادیانے نہ ڈھولک نہ بھنگڑا صرف چند مہمان شریک ہوئے جو اپنے اپنے گھروں سے شادی میں شرکت کو آئے اور کھا پی کر وہیں سے رخصت ہو گئے۔ بہت بے رونقی سی شادی تھی مگر کتنی آسان، میں نے سوچا۔ ہمارے ہاں تو کئی دن پہلے سے مہمانوں کا تانتا بندھ جاتا تھا کچھ روٹھ جاتے تھے کچھ نقص نکالتے

تھے۔ عجب بھگدڑ کا سماں ہوتا تھا۔ روٹھے ہوؤں کو منانا، ہر مہمان کی آؤ بھگت کرنا، نکتہ چینیوں کو برداشت کرنا، بہن بھائیوں کو شریکا بنتے ہوئے دیکھنا اور سب کچھ بڑے حوصلے سے برداشت کرنا ہی شادی کی کامیابی سمجھا جاتا تھا۔ محلے کے بہت سے گھروں سے ان کی بیٹھک خالی کروا کے دور سے آئے مہمانوں کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ آس پڑوس سے بستر اکٹھے کئے جاتے تھے۔ بہت وقت ہوتا تھا تب لوگوں کے پاس۔ شادی سے کئی کئی دن پہلے آتے اور شادی کے بعد بھی ہفتوں قیام کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے میری شادی پر پشاور اور ڈیرہ اسماعیل خان سے میری پھوپھیاں پندرہ دن پہلے آ گئی تھیں اور پھر مہینوں نہیں گئی تھیں کہ وہ شہروں شہروں دیگر عزیز رشتہ داروں کے ہاں حاضری دیتیں اور گھوم پھر کر پھر ہمارے ہاں ڈیرے ڈال لیتی تھیں۔ شادی کے بعد بھی کئی مہینوں تک یہ شادی چلتی رہی تھی اور امی ابا مہمانوں کی خاطر داری کرتے کرتے کنگال ہونے کو تھے۔

ذکیہ میری رشتہ دار تھی سو دونوں گھرانوں میں ایک سی کیفیت تھی۔ ہم ہر وقت مہمانوں کے گھیرے میں رہتے۔ اکیلے کہیں جانے کا تو تصور ہی نہ تھا۔ سیر کرنے جاتے تو قافلہ ہمارے ساتھ ہوتا۔ سینما دیکھنے جاتے تو بھی ایک میلے کی صورت بن جاتی۔ کبھی کبھی تو ہم دونوں ترس ہی جاتے کہ کہیں تو اکیلے گھومنے پھرنے جا سکیں مگر ہماری جرات ہی نہ تھی کہ اس بے ادبی کے مرتکب ہوتے مگر یہ سب تو نصف صدی پہلے کا قصہ تھا۔ اب زمانہ بدل گیا تھا۔ بیٹا شادی کے دو دن بعد بہو کو لے کر ورلڈ ٹور پر چل دیا تھا اور ہم واپس اپنے گھر لوٹ آئے تھے۔ زندگی اپنی مخصوص ڈگر پر چل رہی تھی۔ میں نے ریٹائرمنٹ بعد ایک پرائیویٹ یونیورسٹی جوائن کر لی تھی جبکہ ذکیہ نے ملازمت کے کئی سال باقی ہونے کے باوجود ریٹائرمنٹ لے لی تھی کیونکہ اچانک ہی اس کی صحت نے ساتھ چھوڑ دیا تھا اور وہ بستر سے جا لگی تھی۔ دونوں بچے ماں کی بیماری کا سن کے دوڑے چلے آئے اور ذکیہ کو ساتھ لے گئے مگر وہاں بھی اس کی طبیعت نہ سنبھلی۔ دنیا بھر کے کینسر کے مریضوں کو صحت یابی سے ہمکنار کرنے والا شاہ میر دکھی ہو گیا۔ اس کے پاس ماں کی بیماری کا علاج نہ تھا۔ ہم نے پیسہ پانی کی طرح بہا دیا مگر ذکیہ کو نہ بچا سکے۔

میں اکیلا رہ گیا۔ بالکل اکیلا۔ بچے باہر تھے، ماں کے مرنے پر آئے کچھ دن رہے۔ مجھے ساتھ لے جانا چاہا مگر میں نے نہ کر دی۔ بچے افسردہ سے واپس چلے گئے اور میں دو کنال کے گھر میں تنہا رہ گیا۔ ذکیہ کی جدائی نے مجھے آدھ موا کر ڈالا۔ میں نے سوچا۔ ایک عورت کے جانے سے میری دنیا کتنی ویران ہو گئی ہے۔ ذکیہ میری زندگی کا محور و مرکز تھی۔ گو ہم دونوں، ہم مزاج نہ تھے مگر زندگی کی راہوں پر باہمی تفاوت سے چلتے آ رہے تھے۔ بڑے بڑے فیصلے مل کے کرتے رہے تھے۔ اچھے برے حالات کا سامنا ہم نے باہم مشوروں سے کیا تھا۔ میں گھر داری میں نکما تھا۔ میرے سب کام ذکیہ ہی کے ذمے تھے۔ میں نے کیا پہننا ہے؟ میں۔ نے کیا کھانا ہے؟ مجھے کہاں جانا ہے؟ کب جانا ہے؟ یہ سب اسے اچھی طرح معلوم ہوتا تھا۔ وہ میری پسند ناپسند کا خیال رکھتی تھی۔ مجھے اپنی ہر چیز اپنی جگہ تیار ملتی تھی۔ جوتی، جراب، ٹائی، شرٹ مجھے کبھی بھی کچھ ڈھونڈنا نہیں پڑا تھا۔ اس نے سارے ملازم سدھار رکھے تھے۔ وہ ملازم تو اب بھی میرے ساتھ تھے مگر وہ مجھ سے اور میں ان سے آشنا نہ تھا۔ مجھے ان سے کام لینا ہی نہیں آتا تھا۔

زندگی بہت مشکل ہو گئی تھی ذکیہ کے بغیر۔ اتنی مشکل کہ میرے لئے گھر سنبھالنا تو در کنار خود کو سنبھالنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ سمیر مجھ سے بہت لگاؤ رکھتا تھا اس صورتحال سے پریشان بھی تھا۔ خیال تو شاہ میر بھی بہت کر رہا تھا حالانکہ وہ ماں سے زیادہ قریب تھا مگر اب میری تنہائی اور اداسی دیکھ کر وہ بھی بہت ملول تھا۔ لہٰذا دونوں بھائیوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا اور پاکستان آ گئے۔ بچے ایک ہفتہ میرے پاس رہے اور اس ایک ہفتے میں ہم دلگرفتہ سے بیتے دنوں کو یاد کرتے رہے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی ضد کرتے تھے اور آخر کار اپنی بات منوا کے مجھے ساتھ لے بھی گئے۔ میں پورا سال برطانیہ میں رہا۔ میرے دونوں بیٹے ہر طرح سے میرا خیال رکھتے رہے۔ چھٹیوں میں دونوں بھائی اکٹھے ہو جاتے تھے۔ مجھے خوب سیریں کراتے، گھماتے پھراتے اور میرا دل لگانے کی بھرپور کوششیں کرتے مگر میں پرانے زمانے کا بندہ وہاں کی مشینی اور بے رونق زندگی میں خود کو فٹ نہ کر سکا۔

مجھے اپنے دیس کی رونقیں یاد آتی تھیں۔ اپنے شہر لاہور کے میلے ٹھیلے یاد آتے تھے جہاں پہلے کبھی سات دن میں آٹھ میلے لگتے تھے مگر اب تو ایک دن میں ہی کئی کئی تقریبات بجتی تھیں سو میں پاکستان واپس پلٹ آیا۔ دونوں بیٹوں نے میری زندگی میں رنگ بھرنے کی کوشش کی۔ شادی کیلئے زور دیا مگر میں ذہنی طور پر تیار ہی نہیں ہوا۔ میں ذکیہ اور اس کی خدمات کو بھلا نہیں سکا۔ میں خود کو بھی سنبھال نہیں سکا تھا، گھر کو نہیں سنبھال سکا تھا سو اپنی بیوہ بہن کو اپنے پاس لے آیا۔ اس کے بچوں کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ اپنے بھانجے بھتیجے پالتا رہا، غریبوں بیواؤں کی مدد کرتا رہا لیکن جب میری بہن فوت ہوئی تو پھر تنہائی کا پہاڑ میرے سر پر آ گرا۔ میری سب سے چھوٹی بہن نے مجھے شادی کر لینے پر آمادہ کرنا چاہا کیونکہ کوئی بہن بھائی بھی مستقل میرے پاس نہیں رہ سکتا تھا۔ میرے لئے پھر مشکل ہو گئی تھی۔ گھر چیزوں سے بھرا پڑا تھا مگر میں خالی تھا۔ اندر سے بالکل خالی۔

میں عورت کا رسیا نہیں تھا مگر میں عورت کے بغیر رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ جسمانی ضرورتیں مجھے ساتھ کیلئے اُکساتی تھیں اور گھر کے جھنجھٹ مجھے آدھ موا کیے جاتے تھے سو میں نے اپنی بہن کی تجویز ماننے کا فیصلہ کر لیا اور ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد اسے رشتہ ڈھونڈنے کیلئے کہہ دیا۔ میں نے بیٹوں سے بھی اس بارے مشورہ کیا تھا۔ انہیں اس پہ کوئی اعتراض تو نہیں تھا مگر خدشہ ضرور تھا۔ دونوں ایک ہی بات کی رٹ لگائے ہوئے تھے کہ وطن عزیز میں حالات مخدوش ہیں۔ کوئی دھوکا ملا تو آپ بکھر جائیں گے پاپا جی، یہاں ہمارے پاس آ کے کسی گوری سے شادی کر لیں۔ اپنی اپنی شرائط کے ساتھ نیا سفر شروع کریں مگر میں نہ مانا۔ دل میں کسی خدشے نے سر اٹھایا بھی تو میں نے جھٹک دیا کہ میں کم عمر ہوں نا کم عقل جو کسی کے جھانسے میں آ جاؤں گا۔ میں سب سنبھال لوں گا مگر اپنا دیس چھوڑ کے نہیں جاؤں گا کہ میرا جینا مرنا اسی دیس کیلئے ہے۔

کافی چھان بین کے بعد میری بہن کو ایک عورت پسند آ گئی۔ طلاق یافتہ، پڑھی لکھی خاتون جو پچاس پچپن کے پیٹے میں تھی۔ شوہر سے اس کی نہیں بنی اور پھر ماں باپ کے زور دینے پر بھی دوسری شادی اس نے کی نہیں لیکن اب باپ کے مرنے کے بعد بھائی بھابھی کے رویئے کو دیکھتے ہوئے اس نے شادی پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔ گھر بار اچھا تھا۔ مجھے اس خاتون سے ملوایا گیا اور پھر ایک دو میٹنگز کے بعد ہم نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ سادگی سے شادی ہوئی اور تہمینہ میرے گھر میں میری بن کے چلی آئی۔ میرے ویران گھر میں رونق اتر آئی۔ میری اداس زندگی میں خوشیوں کی پھوار ہونے لگی۔ وہ خاصی بولڈ، سلیقہ مند اور سمجھ دار خاتون تھی۔ اس نے جلد ہی سارے ماحول میں خود کو رچا بسا لیا۔ میرے بہن بھائیوں کو اپنا اسیر کر لیا۔ ملازموں کو اپنی مٹھی میں لے لیا۔ سب اس کے گن گانے لگے۔ میں بھی کافی حد تک پر سکون ہو گیا۔ میری توقع سے بڑھ کر میرا خیال رکھا جانے لگا۔ ناشتہ کھانا وقت پہ ملنے لگا۔ کپڑے جوتی ہر شے اپنی جگہ پہ پائی جانے لگی۔ میں اپنے رب کے حضور سربسجود ہو گیا کہ عمر کے اس آخری حصے میں پر سکون زندگی نصیب ہوئی اور جان لیوا تنہائی نے میرا پیچھا چھوڑ دیا۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا ایک دم بہت اچھا۔ تہمینہ نے مجھے خاصا سنبھال لیا تھا۔ میرے کھانے پینے، آنے جانے، لین دین ہر بات کا خیال رکھنے لگی تھی بلکہ اب تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں مکمل طور پر اس کے کنٹرول میں آ گیا تھا۔ اس کی مرضی کے بغیر میرے لئے کچھ کرنا ناممکن ہونے لگا تھا۔ ہر کام اس کی اجازت سے کرنا مجھ پہ لازم ہو گیا تھا۔ ہر جگہ اسے بتا کے جانا مجھ پر واجب ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی زبان کھلنے لگی تھی۔ میرے، بہن بھائیوں کی آمد و رفت بھی کم ہونے لگی تھی۔ میرے پرانے ملازموں کی چھانٹی کر دی گئی تھی۔ ڈرائیور کو بھی فارغ کرا دیا گیا تھا۔ اب تو مجھے کسی محفل میں، کسی تقریب میں جانا ہوتا تو تہمینہ کی منت سماجت کرنا پڑتی تھی۔ وہ مجھے گاڑی چلانے نہیں دیتی تھی کہ اس کے خیال میں بہتر اسی سال کی عمر میں گاڑی چلانا مناسب نہیں۔ میں بے اختیار سا ہوتا جا رہا تھا۔ ساٹھ سالہ تہمینہ کو مجھ پون صدی گزارے ہوئے، ایک پڑھے لکھے بندے میں اب نقص ہی نقص نظر آنے لگے تھے۔ میرے بڑھتی ہوئی عمر اسے عجیب لگنے لگی تھی۔ گھر، پیسہ سب اس کی دسترس میں تھا۔ وہ اپنے آپ کو مضبوط کرنے کی کوششوں میں مجھے نیچا دکھانے پہ تلی تھی اور اب میں نذیر صاحب کی بجائے بابا جی ہو گیا تھا۔

امکان کی رُت گئی نہیں ہے
گر دل کی کلی کھِلی نہیں ہے

کچھ کچھ تو ہوا ہے فاصلہ کم
دیوار مگر گری نہیں ہے

مژگاں چشم خواب ہے وہ
یہ رمز مگر کھلی نہیں ہے

جس سے ہوئی کائنات روشن
وہ آگ ابھی بجھی نہیں ہے

خالی رہی وقت کی صراحی
بھر بھر کر بھی بھری نہیں ہے

دیکھوں تو نہیں ہے پاس کچھ بھی
سوچوں تو کوئی کمی نہیں ہے

اک شمعِ امید بھی ہے لرزاں
آنکھوں میں فقط نمی نہیں ہے

کیا چاند اتر گیا زمیں پر
کیا رات ابھی ڈھلی نہیں ہے

کیوں صبحِ وطن ہے اتنی بے نور
کیا دھوپ ڈھلی ہوئی نہیں ہے

احمد ندیم رفیع/لاہور

لا۔ شے

سیّد تحسین گیلانی / لاہور

سفید پرندہ نما فضا میں معلق تھا۔۔۔ نہ دن تھا نہ رات تھی وقت یوں کہ جیسے رُک سا گیا تھا۔۔۔۔ پرندہ اس اجنبی بو کو سونگھ رہا تھا۔۔۔۔۔اور مسلسل پر پھڑ پھڑا رہا تھا۔۔۔۔۔ میں وہاں تھا__ آئینہ بھی وہیں تھا_ لیکن یہ کیا؟؟ میں آئینے میں نہیں تھا!!!! کچھ سہمے ان دیکھے سایوں کا احساس مجھے ہو رہا تھا۔۔۔۔ شاید میں بھی ہوا میں معلق تھا۔۔۔۔۔ پر پھڑ پھڑا رہا تھا _لیکن یہ پر کہاں سے آئے۔۔۔۔؟؟؟ میں تو بے پر تھا۔۔۔ اور۔۔۔۔ اور وہ آئینہ نہیں تھا۔۔۔۔۔ آسمان تھا کالا آسمان ۔۔۔۔ کالا آسمان !!!وہاں تو کچھ بھی روشن نہیں تھا_ اندھیرا ہی اندھیرا تھا لیکن مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا سب کچھ صاف __ سب صاف تھا کہ وہاں کچھ نہیں تھا !! کہ اچانک کوئی خیالی جسم مجھ سے ٹکرایا _میں بے قابو دور تلک اڑتا اڑتا چلا گیا۔۔۔ اچانک منظر بدل گیا۔۔۔۔ میں کسی لال جزیرے میں نکل آیا تھا !!! کوئی پکارا۔۔۔۔ ادھر دیکھو !میں نے ادھر ادھر دیکھا کچھ نظر نہ آیا_ تو پکارنے والا پکارا۔۔۔۔ صرف سنو !!میں قریب ہی ہوں بس محسوس کرو۔۔۔۔۔ میں تمہاری "میں" ہوں !!لا "شے "ہوں تم کبھی انسان تھے ۔۔۔۔!!؟؟ تھا تو۔۔۔۔ !!!! نہیں بلکہ ہوں __میں نے پھر خود کو آئینے میں تلاشنا چاہا۔۔۔۔۔ لیکن میں وہاں نہیں تھا، صرف آسمان تھا۔۔۔۔ اب کی بار لال آسمان پکارنے والا ہنستے ہوئے بولا__ یعنی میں لا "شے "ہو کر بھی تم میں ہوں۔۔۔۔ اور تم۔۔۔ تم۔۔۔۔ سب ہو کر بھی نہیں ہو۔ !!! میں نے کہا یہ شاید تمہاری وجہ سے تو نہیں ہے؟؟ نہیں میری نہیں __ تمہاری اپنی وجہ سے ہی یہ سب ہے۔ کیونکہ کہ تم نے مجھے پوجا۔۔۔۔ یاد کرو محبت میں عبادت میں قرابت میں دوری میں رفاقت میں حجابت میں خیالوں میں۔۔۔۔۔ اندھیروں میں۔۔۔۔ اجالوں میں۔۔۔ تم نے صرف اور صرف مجھے چاہا__ یعنی خود کو چاہا_ بہت بار لمحوں نے تمہیں پکارا کہ اس کی پوجا مت کرو_ یہ لال جزیرے کا راستہ ہے۔ لیکن تم اس کی پوجا میں ایسے مگن تھے کہ تم نے دھیان ہی نہیں دیا۔ میں سب سنی ان سنی کر رہا تھا... لیکن تم اور میں دکھائی کیوں نہیں دے رہے... یا کیا تم مجھے دیکھ رہے ہو؟؟ ہاں ہم تمہیں دیکھ رہے ہیں !!_ ہم سے تمہاری کیا مراد ہے۔؟ وقت آنے پر سب پتہ چل جائے گا... ابھی سنو!!! اچھا !! تو میں کیوں نہیں دیکھ پا رہا؟ ہاہاہاہا تم تب بھی دیکھ نہیں پائے تھے __آج بھی دیکھ نہیں پاؤ گے !!__ وہ لال پہاڑ دیکھو۔ کہاں؟ اب دیکھو!_ہاں، ہاں، ہاں، اب نظر آیا۔۔۔۔ آہ یہ کیا ہے؟؟ اتنا بڑا پہاڑ!! ہاں یہ پہاڑ تم نے بنایا ہے _میں نے ؟؟؟ وہ کیسے؟؟ ارے لیکن اس سے تو لاوے کے جیسے سرخ خون بہہ رہا ہے۔ آقا اسے ہٹاؤ۔۔۔۔ ہاں اسے تم نے بنایا ہے۔۔۔ مجھ جیسوں کی مدد سے مل کر۔۔۔۔ وہ سب بھی یہاں میرے ساتھ ہیں تمہارے تمام قریبی ساتھی۔۔۔ باری آنے پر ان سب سے بھی ملاقات ہو گی __غور سے دیکھ لو اس پہاڑ کو۔۔۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔۔ اسے ایک بار قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں ...ابھی جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ میں اس سے قریب تر تھا۔۔۔ عین قریب۔۔۔ میں ہوا میں ہی معلق تھا وہ سفید پرندہ نما اب لال ہو چکا تھا۔۔۔ مسلسل پر پھڑ پھڑائے جا رہا تھا۔ اس پہاڑ سے اٹھتی ناگوار بو کو سونگھ رہا تھا۔۔۔ گاڑھے خون کی بدبو۔۔۔۔ چبائے ہوئے کچے گوشت کی سڑاند۔۔۔ آسمان۔۔۔ زمین۔۔۔ سارا منظر لال تھا۔۔۔ !! کوئی پھر پکارا۔۔۔ دیکھ لو غور سے دیکھ لو یہ تمہاری زبان کا تھوک ہے۔۔۔۔ جو یہاں جمع ہے !! میں چلایا چیخا لیکن آواز تھی کہ گلے سے نکل ہی نہیں رہی تھی۔۔۔ رکو، رکو، رکو، یاد آیا میرے، پاس ایک سبز وعدہ بھی تو تھا۔۔۔ وہ کہاں ہے؟؟؟ شاید۔۔۔ ہو گا۔۔۔ لیکن اسے تم نے ہمارے ساتھ مل کر زندہ دفنا دیا۔ کچھ کرو مجھے یہاں سے نکالو۔۔۔ شور مت کرو ابھی تو ملاقاتیں باقی ہیں ۔۔۔۔ نہیں نہیں نہیں مجھے اس لال جزیرے سے نکالو میں مر جاؤں گا ہا، ہا، ہا، آؤ تمہیں تمہارے ایک اور عزیز دوست تمہارے اپنے "تم "تمہیں سے ملواتے ہیں۔

منظر ایک بار پھر بدل گیا۔۔۔۔۔ میں کسی سیاہ وادی میں تھا کالے کانٹوں بھری نوکیلی زمین پر کھڑا تھا کہ اتنے میں میرے اندر میری آنکھ کھلی۔۔۔ اور آواز آئی:

وَالْعَصْرِ ؛ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ۔

CamScanner

انجینئر ظفر محی الدین/ لاہور

پردیسی کی تنہائی

دبئی کی جگمگاتی سڑکوں پر تیز دوڑتی گاڑیوں کے درمیان شاہد ایک معمولی سا پرزہ تھا۔ ہزاروں مزدوروں میں سے ایک، جو خوابوں کی چمک میں اپنی حقیقت بھول چکے تھے۔ وہ پچھلے دس سالوں سے یہاں محنت کر رہا تھا، صبح سے شام تک پسینے میں بھیگا، ہڈیوں میں تھکن بسائے، ایک ایسی زندگی گزار رہا تھا جس میں صرف ذمہ داریاں تھیں، خوشیاں نہیں۔

وہ روزانہ اپنے چھوٹے سے کمرے میں آ کر تھکے ہارے بستر پر گرتا، مگر نیند نہیں آتی تھی۔ موبائل کی اسکرین پر گاؤں کی تصویریں دیکھتے ہوئے اس کا دل بوجھل ہو جاتا۔ ماں کا جھریوں بھرا چہرہ، بہن کی مسکراتی آنکھیں، آنگن میں لگا وہ پرانا نیم کا درخت سب کچھ یاد آتا۔ وہ اکثر سوچتا، کیا یہ قربانی واقعی ضروری تھی؟ کیا غربت سے بچنے کے لیے اپنوں سے دوری ہی واحد راستہ تھا؟

ہر مہینے تنخواہ آتی اور وہ بنا کچھ سوچے سب پیسے ماں کو بھیج دیتا۔ خود کے لیے وہ کبھی کچھ نہ رکھتا، جیسے اس کی کوئی خواہش ہی نہ ہو۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ اس کے دل میں بھی ایک حسرت پلتی تھی۔ ایک دن سب کچھ چھوڑ کر واپس گاؤں جانے کی، ماں کے پاس بیٹھنے کی، کھیتوں میں ہلکی دھوپ میں چلنے کی، زندگی کو قریب سے محسوس کرنے کی۔

پھر ایک دن، پاکستان سے فون آیا۔ ماں بیمار تھی، بہت بیمار۔ شاہد کے قدموں تلے زمین نکل گئی۔ وہ فوراً ٹکٹ کے پیسے جوڑنے لگا لیکن حساب لگایا تو پتا چلا کہ اتنے پیسے ہی نہیں۔ وہ جیسے ایک بند گلی میں آ کر رک گیا تھا، جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

اس رات وہ چھت پر جا بیٹھا۔ دبئی کی روشنیاں دور تک پھیلی ہوئی تھیں، مگر اس کے لیے سب بے معنی تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ چاند تنہا تھا، بالکل اس کی طرح۔ وہ سوچنے لگا، کیا پردیسی ہونا واقعی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے؟ دوسروں کے لیے جینا اور خود اندر سے آہستہ آہستہ مٹ جانا؟

ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی اور شاہد کی آنکھوں میں خاموش آنسو جھلملانے لگے۔

پاگل خانے کی کھڑکی

لائل پور کے پاگل خانے میں ایک بوڑھا قیدی تھا۔ سفید بکھرے ہوئے بال، آنکھوں میں عجیب سی چمک اور ہاتھ میں ایک پرانا، مڑا تڑا کاغذ۔ وہ دن بھر دیوار کے قریب بیٹھا رہتا، اس کاغذ کو غور سے دیکھتا اور زیرِ لب مسکراتا۔

ایک دن وارڈ کا نیا ڈاکٹر آیا۔ اس نے بوڑھے کو دیکھا اور پوچھا،

بابا، کیا ہے اس کاغذ میں؟

بوڑھے نے مسکرا کر کاغذ آگے کر دیا۔ ڈاکٹر نے کھولا، اندر بس ایک نام لکھا تھا: حسینہ

یہ کون ہے؟ ڈاکٹر نے پوچھا۔

بوڑھا ہنسا، جیسے کسی بچے کی معصومیت پر حیران ہو۔

حسینہ؟ وہ تو میری بیوی تھی۔

پھر یہاں کیسے؟

بوڑھے نے کھڑکی کی طرف دیکھا، جہاں سے جیل کے باہر کی دنیا دکھائی دیتی تھی۔

وہ مر گئی، صاحب۔ میں پاگل ہو گیا۔ مجھے یہاں بھیج دیا گیا۔

ڈاکٹر نے ہمدردی سے سر ہلایا، کب کی بات ہے؟

بوڑھے نے کاغذ پر انگلی پھیری، جیسے وہ وقت کو چھو رہا ہو۔

ابھی کل کی یا شاید پچاس سال پہلے کی۔

ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی اور جانے لگا۔ مگر دروازے پر پہنچ کر پلٹا،

یہ کاغذ تم ہر وقت کیوں دیکھتے ہو؟

بوڑھا ہنسا، کھڑکی کی طرف دیکھا اور بولا،

کیونکہ یہ آخری چیز ہے جو مجھے یقین دلاتی ہے کہ میں پاگل نہیں ہوں!

خالص دودھ کی مہک

ارشد ایک سادہ دل گوالا تھا۔ اس کا گاؤں سرسبز تھا، جہاں وہ اپنے مویشیوں کے ساتھ صبح سویرے جاگتا، دودھ نکالتا اور قریبی قصبے میں بیچ کر اپنی روزی کماتا تھا۔ گاؤں کے لوگ اسے پسند کرتے تھے، کیونکہ وہ ایماندار اور ہنس مکھ تھا۔

اس کا خواب تھا کہ وہ اپنی دودھ بیچنے کی محنت سے کچھ بڑا کرے۔ وہ اکثر سوچتا، اگر میں زیادہ لوگوں تک پہنچا تو شاید میں اپنے گاؤں کو نام دے سکوں۔

ایک دن قصبے میں ایک شہری تاجر ملا جس نے ارشد سے کہا، تمہارا دودھ بہت خالص ہے۔ اگر تم شہر میں آ کر بیچو، تو بڑا کاروبار کھڑا کر سکتے ہو۔

ارشد کے دل میں امید جاگ اٹھی۔ وہ راتوں کو جاگ کر سوچتا رہا کہ کیا واقعی وہ شہر جا کر بڑا آدمی بن سکتا ہے؟ آخر کار، اس نے فیصلہ کر لیا۔

CamScanner

شہر پہنچ کر ارشد کو پہلی بار احساس ہوا کہ یہاں کی زندگی گاؤں سے بالکل الگ ہے۔ ہر شخص جلدی میں تھا، ہر کوئی فائدہ اٹھانے کے چکر میں تھا۔

ابتدائی دنوں میں اسے کافی دھوکے بھی ملے۔ کچھ لوگوں نے اس کا دودھ ادھار پر لیا اور پیسے نہیں دیے، کچھ نے کم قیمت لگائی۔ وہ کئی بار سوچتا، یہ میں کہاں آ گیا؟ مگر پھر بھی حوصلہ نہ ہارا۔

وقت گزرتا گیا اور ارشد کی محنت رنگ لانے لگی۔ وہ اپنا دودھ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے لگا۔ اس نے شہر میں ایک بڑی دکان کھولی اور کچھ ملازم رکھ لیے۔

اب اس کی دودھ والی گاڑی روز صبح شہر کے بڑے گھروں میں تازہ دودھ پہنچانے لگی۔ لوگ اس کے خالص دودھ کے دیوانے ہو گئے۔ وہ مشہور ہونے لگا اور پیسے کی ریل پیل ہونے لگی۔

کامیابی کے ساتھ ساتھ ارشد میں تبدیلیاں آنے لگیں۔ اس نے بہتر لباس پہننا شروع کر دیا، بڑی گاڑیاں خرید لیں اور فیکٹریاں لگا لیں۔ اب وہ وہی ارشد نہیں تھا جو کبھی گاؤں کے کنویں پر بیٹھ کر گپ شپ لگاتا تھا۔

اس کی مصروفیت اتنی بڑھ گئی کہ اس نے گاؤں جانا ہی چھوڑ دیا۔ پرانے دوستوں کے فون آتے تو وہ بہانے بنا کر ٹال دیتا۔ ماں باپ کی طبیعت خراب ہونے کی خبریں بھی اس کے لیے معمولی لگنے لگیں۔

ایک دن، وہ اپنی گاڑی میں بیٹھا تھا جب ایک بوڑھا گوالا سڑک کنارے دودھ بیچتا نظر آیا۔ ارشد کو اپنا ماضی یاد آ گیا۔ وہ سوچنے لگا، میں بھی کبھی ایسا تھا، مگر اب...؟ میں وہ نہیں رہا بلکہ کتنا بدل گیا ہوں یہ ہر طرف اونچی عمارتیں، شور کرتی گاڑیاں، مصروف لوگ، یہ سب کچھ اس کے لیے اجنبی سا تھا۔ وہ یہاں اپنے خوابوں کی تعبیر پانے آیا تھا، مگر دل کہیں اور اٹکا تھا۔

ذہن ماضی کی گلیوں میں بھٹکنے لگا۔ اسے اپنا گاؤں یاد آیا، جہاں مٹی کی سوندھی خوشبو تھی، کھیتوں میں سرسبز فصلیں جھوم رہی ہوتی تھیں اور شام ہوتے ہی پرندے گھونسلوں کو لوٹ جاتے تھے۔ اس کی ماں، جس کے ہاتھ کی روٹی کا ذائقہ کسی شہر کے ہوٹل میں نہیں مل سکتا تھا، جس کی دعائیں اس کے ہر سفر میں محافظ بنی رہتی تھیں، وہ ماں آج بھی دروازے پر نظریں جمائے اس کے لوٹنے کی امید میں بیٹھی ہوگی۔

اسے وہ دن یاد آیا جب وہ شام کے وقت کھیتوں کے کنارے بیٹھ کر ماں سے دنیا بھر کی باتیں کرتا تھا۔ ماں اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر کہتی، بیٹا، بڑا آدمی بن جانا، مگر دل ہمیشہ گاؤں جیسا رکھنا۔

شہر کی تیز رفتار زندگی میں ارشد کہیں کھو گیا تھا، مگر ماں کی یادیں اور گاؤں کی سادگی اسے بار بار واپس بلا رہی تھیں۔ آج وہ سوچ رہا تھا، کیا وہ واقعی بڑا آدمی بننے آیا تھا یا اپنوں سے دور ہونے آیا تھا؟

شہر کی چکا چوند روشنیوں میں ارشد کی آنکھیں اب تھکنے لگی تھیں۔ مصنوعی مسکراہٹوں، مصروف سڑکوں اور بلند عمارتوں کے اس جنگل میں وہ خود کو اجنبی محسوس کرنے لگا۔ ہر روز صبح نوکری پر جانا، بے روح چہروں کے درمیان وقت گزارنا اور رات کو تھکا ہارا بستر پر گر جانا، یہ زندگی تو اس نے کبھی نہیں چاہی تھی۔

اس کا دل اچانک شدت سے گاؤں کی کھلی فضا، کھیتوں میں بہتی ہوا اور ماں کی دعاؤں میں لپٹے اس آنگن کو یاد کرنے لگا جہاں اس کا بچپن گزرا تھا۔ اسے وہ دن یاد آیا جب بارش کی پہلی بوندیں مٹی کو بھگو کر سوندھی خوشبو بکھیرتی تھیں، جب شام کو بابا کے ساتھ بیٹھ کر ستاروں کی باتیں کیا کرتا تھا، جب ماں کا آنچل ہر درد کی دوا ہوتا تھا۔

ایک روز، جب وہ کام سے لوٹ کر اپنے عالیشان گھر میں پہنچا، تو ایک لمحے کے لیے آئینے میں خود کو دیکھا، ایک تھکا ہوا، بجھا بجھا سا چہرہ، جس کی آنکھوں میں خواب تو تھے، مگر سکون کہیں کھو گیا تھا۔ وہ اور نہیں سہہ سکتا تھا۔

اسی لمحے اس نے فیصلہ کر لیا۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر گاؤں جائے گا، جہاں رشتے مصنوعی نہیں، جہاں درختوں کے سائے میں سچائی بستی ہے، جہاں محبت کھری اور خالص ہے۔ اس نے جلدی جلدی اپنا سامان باندھا، الماری میں رکھی ماں کی ایک چٹھی نکالی اور مسکرا کر کہا،

ماں، تیرا بیٹا لوٹ رہا ہے۔

شہر کی روشنیوں کے بیچ گاؤں کی امید کا دیا جل چکا تھا۔ وہ پرسکون ہو چکا تھا، جیسے کوئی مسافر طویل سفر کے بعد اپنے اصل گھر کا راستہ پا چکا ہو۔

اسی رات اس نے پرانی تصویریں نکالیں۔ گاؤں کا گھر، کھیت، گلیاں اور وہ پرانے دوست، سب کچھ جیسے اسے بلا رہے تھے۔

اگلے دن ارشد نے فیصلہ کیا کہ وہ گاؤں جائے گا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو سب کچھ بدلا ہوا تھا، مگر لوگ وہی تھے۔

گاؤں کے بزرگوں نے اسے دیکھ کر کہا، ارشد، تم نے کامیابی تو پا لی، مگر کیا کھو دیا، یہ بھی دیکھو۔

ارشد نے ماں کے قدموں میں بیٹھ کر معافی مانگی، دوستوں سے گلے ملا اور وعدہ کیا کہ وہ اپنے گاؤں سے دوبارہ رشتہ نہیں توڑے گا۔

تبصرۂ کتاب

نام کتاب: عجزِ عاجزانہ

مصنف : عابد حسین قریشی

تبصرہ نگار: تفاخر محمود گوندل

اگر ہم غیر متعصبانہ انداز میں سماج وطن میں پائی جانے والی لرزہ خیز خرابیوں اور قباحتوں کا جائزہ لیں تو بلاشبہ ہم اخلاقی طور پر ایک تشویش ناک انحطاط کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ لاریب اس حقیقت میں سو فیصد صداقت و حقانیت نظر آ رہی ہے جس کی طرف ترجمانِ حیات افلاطون دانش کدۂ حقائق حضرت علامہ اقبالؒ نے سو سال قبل اشارا کیا تھا کہ مشینوں کی حکومت نے نسلِ آدمیت کے احساسِ مروت کو کچل کر رکھ دیا ہے۔ خلوص، ایثار، باہمی شفقت و محبت، اخلاق و اخلاص، برداشت و رواداری بڑی سرعت سے عنقا ہو رہی ہے۔

کتنے خوش مقدر اور بلند حوصلہ ہیں وہ اہلِ قلم جن کے حصے میں اصلاحِ سماج کی ذمے داری آتی ہے اور پھر وہ اسے ایک لامثال عزمِ مصمم کے ساتھ نبھاتے ہیں۔ انہی خوش خصال و باکمال اہلِ قلم میں ہمارے برادرِ گرامی جناب عابد حسین قریشی بھی سرفہرست ہیں۔ آپ ایک طویل عرصے تک وطن عزیز میں عروسِ انصاف کے گیسوئے پریشان کو سنوارتے رہے ہیں اور پھر ''پہلے عدل بیتی'' اور بعد ازاں تجاہلِ عادلانہ کی صورت میں منازلِ کامرانی سے ناآشنا لوگوں کو پیغامِ مسرت و انبساط اور رموزِ کامیابی سے ہم کنار کرتے رہے۔ اب وہ بتدریج اپنے قلم کا دھارا روحانی اقدار کی توضیحات و تشریحات کی جانب موڑ رہے ہیں۔ برادرِ گرامی عابد حسین قریشی جس حسنِ ابلاغ اور فی الواقع ادیبانہ شان سے ایک مصلح قلم کار کے طور پر اسلام کے ایک ارجمند سپاہی کا کردار ادا کر رہے ہیں اُس نے انہیں مشاہیر کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ مشامِ ازل نے آپ کو قلم کی جو توانائی و ثقاہت عطا کر رکھی ہے اُس سے آپ چنگ و رباب کی سرمستیوں کو بھی اُجاگر کر سکتے تھے، لیکن محض لطفِ خداوندی اور ان کی والدہ مرحومہ مغفورہ کی دُعاؤں کا صدقہ ہے کہ ان کا فرزند ارجمند سوئے حرم سے بھٹکے ہوئے آہوؤں میں شامل نہیں ہوا بل کہ اُن خوش قسمت فدا کارانِ توحید و رسالت میں شامل ہوا جن کی آنکھوں کا سرمہ خاکِ مدینہ و نجف ہوتا ہے۔

آپ کی تازہ دل پذیر و دلربا کاوش ''عجزِ عاجزانہ'' (جیسا کہ اس کی جاذبیت نام سے ہویدا ہے) بڑے ہی درد انگیز اور سوز و گداز سے لبریز مضامین کا وجدانی آمیختہ ہے۔ عجز عاجزانہ میں شامل تمام مضامین میں ایک مغیھانہ جامعیت پائی جاتی ہے۔ یہ اصلاحِ احوال کے لیے ایسا عدیم النظیر مرقع ہے جو فطری طور پر ہی تربیتِ نفس کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔ صاحب کتاب محترم عابد قریشی نے شدت سے اس تلخ حقیقت کو محسوس کیا کہ زر پرستانہ روش کو اپنی زندگی کا مطمعِ نظر بنا لینے والی اس موجودہ نوجوان نسل کو اگر روحانیت کی طرف راغب و مائل نہ کیا گیا تو اس پر مغربی افکار و نظریات اپنا تسلط جما لیں گے۔ چناں چہ آپ نے مخزنِ ہدایت قرآن و صاحب قرآن کو اثاثۂ نجات قرار دینے پر اپنا زورِ قلم صرف کر دیا۔ محترم قریشی صاحب کے خیال میں یہی وہ نظریۂ حیات ہے جو بادۂ شبانہ کی بھٹکتی ہوئی سرمستیوں کو جرعہ صبائے وحدت عطا کرتا ہے۔ اسی سے حرف ناشناس طفلانِ دہر شیرِ زندگانی کے آغاز سے آشنا ہوتے ہیں۔ یہی چراغِ ہدیٰ ذرۂ بے مایہ میں کہکشاں کی ضیا باریاں پیدا کرتا ہے۔ یہ بے آواز اینٹوں میں وہ رنگ بھرتا ہے کہ ان پر عقیق البحر ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے اور یہی دینی نظریہ وہ نازشِ گیتی پناہ ہے جو قطراتِ خون میں رنگ نشاط پیدا کرتا ہے۔

اسلام ہی عظمت ہے ہر اک گوشۂ فن کی
خورشید سے وابستہ ہے تخلیق کرن کی

میں بغیر کسی تصنع اور ریا کے اس اظہارِ حقیقت میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا کہ برادرِ گرامی عابد حسین قریشی نے ''عجز عاجزانہ'' میں جن عنوانات پر خامہ فرسائی کی ہے وہ اتنے حسین و جاذب نظر ہیں کہ معمولی علمی شغف رکھنے والا قاری بھی انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ آپ نے بڑے ہی احسن و خوب صورت اور دلربایانہ انداز میں ضوابط اسلام و قرآن اور صاحب قرآن کے فرامین و تعلیمات پر بحث کی ہے اور جو چیز صاحب کتاب کو اہلِ قلم میں ممیز کرتی جا رہی ہے وہ ادبی حلاوت و سلاست سے لبریز تحریر ہے۔ آپ نے اپنی سروس کی گونا گوں مصروفیات کی وجہ سے بہت دیر کے بعد میدانِ تحریر سے تمسک کیا۔ میرا یہ حسنِ ظن نہیں بل کہ یقین محکم ہے کہ اگر آپ دورانِ سروس بھی کچھ وقت نکال کر طبع آزمائی کرتے رہتے تو آپ کے اشہبِ قلم کی جولانیاں دیکھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتیں۔ مگر دیر آید درست آید کے مصداق آپ کی سرگرمیاں آپ کے سریع القلم ہونے کا ثبوت دے رہی ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک صاحبِ بصیرت و دانش ادب شناس پر ملک و ملت کی طرف سے کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یقیناً اس کا پہلا کام تطہیر سماج اور صراطِ مستقیم سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو خورشیدِ نو کی کرنیں عطا کرنا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں خدائے بزرگ و برتر کا سحابِ کرم محترم قریشی صاحب پر اندازِ فراواں میں

CamScanner

برس رہا ہے۔

محترم قریشی صاحب کے انتخاب کردہ موضوعات ہمیں دعوتِ عمل دے رہے ہیں کہ اگر ہم تقربِ الٰہی حاصل کرنا چاہتے ہیں اگر ہم تمازتِ آفتابِ محشر میں حضورؐ کی زلفِ عنبریں کا سایہ چاہتے ہیں تو ہمیں قرآن اور صاحبِ قرآن کی محبت اپنے دلوں میں پیدا نہیں بلکہ راسخ کرنا ہوگی پھر ہم دیکھیں گے کہ رحمتِ خداوندی قوسِ قزح کے رنگوں کی طرح جھلملاتی ہوئی ہمارے چہار جانب آ موجود ہوگی۔ گردشِ لیل ونہار رُک رُک کر ہمارے نغمۂ گداز کو سنا کرے گی۔ شبِ تارِ الست ہماری آہِ سحرگاہی سے خوف کھانے لگے گی۔ ہماری جبینِ عقیدت کی ساری لکیروں سے قربِ الٰہی کا تاثر اُبھرے گا۔ پھر فردوسِ بریں کی نوید جاں فزا فردوسِ گوش بننے لگے گی۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ بڑا ایمان افروز اور گداز آفرین ہے۔ اس میں محترم قریشی صاحب نے آقائے گیتی پناہ حضور سید المرسلین کی سیرت طیبہ کے کچھ حیات آفرین پہلوؤں پر قلم فرسائی کی سعادت حاصل کی ہے۔ اگرچہ حضورؐ کی سیرتِ اقدس کا ہر گوشہ اپنے اندر انجم فروزاں کی تابانی اور ماہتاب کی درخشانی لیے ہوئے ہے۔ مگر جن نجات بخش پہلوؤں پر صاحبِ کتاب نے اپنے مخصوص انداز میں دلائل و براہین کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے اُن کی عظمت و اہمیت کا فائدہ تمام فدایانِ کوئے بطحا و نجف بخوبی لگا سکتے ہیں۔ بالخصوص ختم نبوت، مقامِ مصطفیٰؐ قرآن کی نظر میں قادیانیت کی آئینی اور شرعی حیثیت بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جب صاحبِ کتاب حضور سید دو عالم کے ساتھ اظہارِ عقیدت کرتے ہیں تو کارکنانِ قضا وقدر ذخیرۂ الفاظ طشتریٔ عقیدت میں سجا کر مصنف کو پیش کر دیتے ہیں۔ یہی عشقِ مصطفیٰؐ جناب عابد قریشی کا سامانِ نجات ہے۔

اک عشقِ مصطفیٰؐ ہے اگر ہو سکے نصیب
ورنہ دھرا ہی کیا ہے جہانِ خراب میں

آخری ابواب اہلِ بیت اطہار کے ساتھ ان کی غایت عقیدت کا آمیختہ و معراج معلوم ہوتا ہے۔ یہی وہ پاک باز اور پاک نگاہ ہستیاں ہیں جن کے اسمائے گرامی کے ساتھ عشق و محبت کی آبرو وابستہ ہے۔ بالخصوص ملکہ اقلیم عفت و عصمت، مخدومہ کائنات سیّدہ النسا حضرت فاطمۃ الزہرا کے حضور بصورتِ نگر گل ہائے عقیدت پیش کرتے ہوئے مصنف ''عجزِ عاجزانہ'' پر جو وجدانی کیفیت طاری معلوم ہوتی ہے وہ انہیں یقیناً چشم تصور میں جنت البقیع مرقد فاطمۃ الزہرا کی زیارت کا شرف بخش دیا کرتی ہوگی۔ گویا ''عجزِ عاجزانہ'' قاری کے اندازِ تفکر کو ذوقِ نمو، تخیل کو پرِ پرواز، نگاہوں میں عمق، دماغ کے تعطل کو روئیدگی، نخلِ تدبر کو برگ و بار، شبِ تاریک کو سپیدۂ سحر کی نوید، گردشِ شام و سحر کو جادۂ شوق سے آشنائی، موجِ صبا کے ہاتھ میں عطرِ محبت کی شمیم انگیزیاں، پیکرِ ذکر وفکر کو ذوقِ وجدان و نغمگی اور فیوض و عرفانِ ذات سے نوازتا ہے۔

منظوم ہدیہ عقیدت

تیرگی میں ہو رہا ہے ضوفشاں عابد حسین
ہے وطن میں منصفوں کا ترجماں عابد حسین
منبع شفقت، محبت پیکرِ ایثار ہے
آزما لیجیے ہے کتنا مہرباں عابد حسین
مل رہا ہے دن بدن اُس کے قلم کو طنطنہ
خوب لکھتا ہے نئی اک داستاں عابد حسین
جو کتب پڑھتا ہے تیری برملا کہتا ہے یہ
زندگی میں تو رہا ہے کامراں عابد حسین
اُن وکیلوں، منصفوں کو کر رہا ہوں میں سلام
بن گیا ہے جن کا میرِ کارواں عابد حسین
ہے تفاخر منتظر اُس کی نگاہِ ناز کا
الغرض، المختصر ہے میری جاں عابد حسین

میری خواہش و دعا ہے کہ خالق ارض وسما، برادرِ گرامی عابد حسین قریشی کے خامۂ نفیس رقم کو ایسی توانائی عطا کرے کہ وہ تادیر تشنگانِ ادب کے قلوب و اذہان کو جگمگاتے رہیں۔ اب تو ماشاء اللہ آپ کے قلم کو بتدریج ادق نگاری کی وہ ثروت بھی حاصل ہو رہی ہے جس کا میں والا وشیدا ہوں۔ آپ نے اہلِ بیت اطہار کے حضور بصورت جو گل ہائے عقیدت پیش کیے ہیں اُن کے توسل سے آپ کو تمازتِ آفتابِ محشر میں حضورؐ کی زلفِ عنبریں کا سایا بھی ضرور عطا ہوگا اور کیا عرض کروں۔

حریم ذات سے پردے سبھی ہٹاتے ہیں
زمینِ فکر کو رستہ نیا دکھاتے ہیں

تلاشِ رمزِ حقائق میں عمر بیتی ہے
شعورِ ذات سے جلوہ خدا کا پاتے ہیں

مے نظر سے بدلتی ہے کائناتِ خیال
نئے ستارے، نئے آسماں سجاتے ہیں

جو ناشناس ہیں ہستی کی بے ثباتی سے
وہ اپنے ہونے کا مژدہ ہمیں سناتے ہیں

ہوا ہے اذنِ تکلم جنونِ سرکش کو
سو آج اہلِ خرد کو غزل سناتے ہیں

یہ سرکشی کی عقوبت بھی کیا قیامت ہے
نبی کے بیٹے بھی طوفاں میں ڈوب جاتے ہیں

حسابِ گردشِ ایام کیا کریں منصورؔ
بھنور ابھر کے نئے دائرے بناتے ہیں

منصور نقوی/

ادبی تقریبات

16 مئی 2026 کی شام گورنمنٹ فرنٹیئر کالج فار ویمن کی پرنسپل پروفیسر ڈاکٹر شاہین عمر کے اعزاز میں ایک پُر وقار تقریبِ پذیرائی کا انعقاد کیا گیا، جسے کاروانِ حوا لٹریری فورم اور خانہ فرہنگ اسلامی جمہوری ایران کے باہمی تعاون سے سجایا گیا۔ یہ خوبصورت ادبی و تعلیمی نشست دراصل ڈاکٹر شاہین عمر کی شخصیت، انکی علمی و ادبی خدمات اور ان کی ہمہ جہت صلاحیتوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے منعقد کی گئی، جہاں اہلِ علم، اساتذہ، ادیبوں اور دوست احباب کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

تقریب کی صدارت ممتاز ادیب، سکالر اور سابق اسٹیشن ڈائریکٹر محترم مشتاق شباب نے کی، جبکہ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے معروف ماہرِ تعلیم، سابق ڈائریکٹر ہائر ایجوکیشن پروفیسر، قاسم مروت شریک ہوئے۔ تقریب کی نظامت پروفیسر ملک ارشد حسین نے نہایت خوش اسلوبی سے کی۔ تقریب کے آغاز میں قاری شاہد اعظم العزہری نے اپنی پرسوز آواز میں تلاوت کلام پاک کی۔ تابندہ فرخ نے نعت رسول مقبول پڑھ کر حاضرین سے داد وصول کی۔ اس کے بعد محترمہ ڈاکٹر شاہین عمر کی کامیابیوں پرمبنی ویڈیو چلائی گئی۔ میزبان کی حیثیت سے ڈائریکٹر خانہ فرہنگ اسلامی جمہوری ایران ڈاکٹر حسین چاقی نے مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔

مقررین نے اپنے خطابات میں کہا کہ ڈاکٹر شاہین عمر نہ صرف ایک بہترین منتظم اور قابل استاد ہیں بلکہ ایک بزلہ سنج، باوقار اور نہایت نفیس انسان بھی ہیں۔ ان کی تعلیمی، انتظامی اور سماجی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی اور ان کی شخصیت نئی نسل کے لیے ایک روشن مثال ہے۔

تقریب میں ڈاکٹر اظہار اللہ اظہار نے ڈاکٹر شاہین عمر کے ساتھ اپنی یادیں اور علمی وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی شخصیت محبت، شفقت اور وقار کا حسین امتزاج ہے۔ جبکہ ڈاکٹر خادم ابراہیم شاہین عمر کے لیے اپنا منظوم تہنیتی پیغام پیش کیا، جس میں عقیدت، محبت اور نیک تمناؤں کے جذبات کو خوبصورت شعری انداز میں پیش کیا گیا۔ حاضرین نے ان کے کلام کو بے حد سراہا اور بھرپور داد دی۔

ادبی رنگ لیے اس تقریب میں روبینہ معین نے ایک دلچسپ اور دلکش خاکہ پیش کیا جس نے محفل کو مزید خوشگوار بنا دیا۔

انجنیئر عتیق الرحمان نے بھی ڈاکٹر شاہین عمر کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

آخر میں چیئرپرسن کاروان حوا لٹریری فورم، محترمہ بشریٰ فرخ نے ڈاکٹر شاہین عمر کے حوالے سے ایک خاکہ پیش کیا اور اس کے بعد اپنا پُر تاثر منظوم کلام سنا کر تقریب کو ایک یادگار ادبی رنگ عطا کیا۔ اس کے بعد مہمان خصوصی پروفیسر قاسم مروت نے ڈاکٹر شاہین عمر کے حوالے سے یادوں کے دریچے کھولے۔ آخر میں صدر محفل مشتاق شباب نے ڈاکٹر شاہین عمر کی شخصیت پر بات کرتے ہوئے تقریب کو بڑے خوبصورت انداز میں اختتامیہ رنگ دیا۔

یہ تقریب محبت، احترام، خلوص اور رفاقت کا حسین امتزاج ثابت ہوئی، جہاں دوستوں، ساتھیوں اور اہلِ علم نے محترمہ شاہین عمر کی شخصیت اور خدمات کو بھرپور انداز میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ان کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

تقریب کے آخر میں کاروانِ حوا لٹریری فورم کی طرف سے ڈاکٹر شاہین عمر کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ جبکہ خانہ فرہنگ اسلامی جمہوری ایران کی طرف سے بھی ہینڈی کرافٹ کا تحفہ پیش کیا گیا۔ بے شمار چاہنے والوں نے پھولوں کے گلدستوں کے تحفے پیش کیے۔ آخر میں مہمانوں کی تواضع چائے سے کی گئی۔

✦✦✦

لاہور (طارق چوہان بیورو چیف الجزیرہ نیوز انٹرنیشنل) نائس ادبی فورم لاہور اور پاک برٹش آرٹس انٹرنیشنل کے اشتراک سے گزشتہ روز اڑتالیسویں ماہانہ مشاعرے کا انعقاد کیا گیا، جس میں شعر و ادب سے وابستہ شخصیات، شعرا کرام اور ادبی حلقوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ مشاعرے کی صدارت عہد حاضر کے نامور شاعر احتشام حسن خان نے کی، جبکہ مہمانان خصوصی میں میجر عمران کھرل، عنبرین خان گل جہان، نعیم عباس ساجد اور سید رضوان رضوی شامل تھے۔ تقریب کے منتظمین میں میڈم سائرہ اقبال سرپرست نائس ویلفیئر سوسائٹی و نائس ادبی فورم محمد علی صابری اور پی بی اے وادبی فورم علی صابری اور بی بی اے لاہور ٹیم کے اراکین شامل تھے، جبکہ جناب ندیم حسن گوہر نے معاون خاص کے فرائض انجام دیئے۔ مشاعرے کی نظامت محترم محمد افضل ساجد نے کی تقریب کا آغاز تلاوت قرآن مجید سے ہوا، جس کے بعد صدارتی ایوارڈ یافتہ نعت خواں صفدر علی شکوری نے اپنے پرسوز انداز میں نعت رسول مقبول ? پیش کر کے حاضرین کے دل موہ لیے۔ مشاعرے میں جونیئر شعرا نے اپنے بہترین کلام سے محفل کو خوب گرمایا، جبکہ سینئر شعرا نے اپنے فکر انگیز اور معیاری اشعار سے سامعین سے بھرپور داد وصول کی۔ سٹیج پر موجود تمام شعرا نے اپنے خوبصورت کلام سے حاضرین کو متاثر کیا۔ صدر مشاعرہ سے کو احتشام حسن خان کے دلکش اور پر اثر کلام پر ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ اپنے صدارتی خطاب میں انہوں نے سے گونج نے منتظمین کو ایک مرتبہ پھر کامیاب اور معیاری ادبی پروگرام کے انعقاد پر مبارکباد پیش کی اور ان کی کاوشوں کو سراہا۔

CamScanner

ادبی رسائل صرف تخلیقات شائع کرنے کا ذریعہ نہیں

مطالعہ کو اپنی زندگی کا لازمی حصہ بنائیں

مدیر اعلیٰ "الحمراء"

شاہد علی خاں

سے مدیر ارژنگ حسن عباسی کا مکالمہ

میری پرورش ایسے خاندان میں ہوئی جہاں علم، ادب اور صحافت صرف پیشہ نہیں بلکہ طرزِ زندگی تھے

جناب شاہد علی خاں کا تعلق برصغیر پاک و ہند کے اس علمی و ادبی خاندان سے ہے جس کا ہر فرد ہمہ آفتاب تھا۔ ان کے والد مولانا حامد علی خان نے اپنی نوجوانی میں ادب سے لو لگائی۔ ان کے آئیڈیل ان کے بڑے بھائی مولانا ظفر علی خان تھے جو انگریزی سامراج کی مخالفت اور مسلمانوں کی سیاسی برتری کے لیے اخبار زمیندار نکالتے تھے۔ حامد علی خان اور ظفر علی خان کے دل میں ادب کی شمع مولانا سراج الدین احمد خان نے جلائی تھی جو شاہد علی خاں کے دادا تھے۔ اخبار زمیندار کی بنیاد بھی انہوں نے ہی رکھی تھی۔ اس خاندان کے ایک اور نامور فرد پروفیسر حمید احمد خان تھے۔ جنہوں نے انگریزی ادب کے استاد کی حیثیت میں ناموری حاصل کی۔ وہ سب اصناف ادب پر نظر رکھنے والے ادیب تھے لیکن مطالعہ غالب ان کا خاص موضوع تھا۔ اسلامیہ کالج لاہور سے پروفیسری شروع کی اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت میں ریٹائر ہو گئے۔ تو تو مجلس ترقی ادب کے ناظم بنائے گئے۔ اردو کے ممتاز مزاح نگار راجا مہدی علی خان جو بعد میں بمبئی جا کر فلمی گانے لکھنے لگے تھے شاہد علی خان کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ اس خاندان کی دو خواتین نے بھی ادب میں بڑا نام پیدا کیا۔ ایک صاحبہ شاعرہ تھیں اور ایک صاحبہ ہمایوں میں افسانے لکھتی تھیں۔ ان کے ایک افسانے ''سفر کا مقصد'' پر فضلی برادر نے فلم نو کر بنائی۔

ارژنگ: آپ کا تعلق ایک نہایت ممتاز علمی و ادبی خاندان سے ہے۔ اس خاندانی ورثے نے آپ کی شخصیت پر کیا اثر ڈالا؟

شاہد علی خاں: میں خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ میری پرورش ایسے خاندان میں ہوئی جہاں علم، ادب اور صحافت صرف پیشہ نہیں بلکہ طرزِ زندگی تھے۔ میرے دادا مولانا سراج الدین احمد خان، والد مولانا حامد علی خان اور چچا مولانا ظفر علی خان نے جو ادبی و فکری روایت قائم کی، وہی میرے لیے سب سے بڑی تربیت گاہ بنی۔

ارژنگ، آپ کے والد مولانا حامد علی خان نے آپ کی ادبی تربیت میں کیا کردار ادا کیا؟

شاہد علی خاں: والد صاحب میری پہلی درسگاہ تھے۔ ان کے ساتھ رسالہ الحمرا میں کام کرتے ہوئے میں نے کتابت، پروف ریڈنگ، ادارت اور تحریر کے آداب سیکھے۔ انہی کی رہنمائی نے میرے اندر ادب سے مستقل وابستگی پیدا کی۔

ارژنگ: آپ نے عملی زندگی کے لیے بینکاری کا شعبہ کیوں منتخب کیا؟

شاہد علی خاں: زندگی کے تقاضوں کے تحت میں نے بینکاری کا شعبہ اختیار کیا اور تقریباً پینتیس برس یونائیٹڈ بینک میں مختلف اعلیٰ عہدوں پر خدمات انجام دیں، لیکن ادب سے میرا رشتہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔

ارژنگ: ریٹائرمنٹ کے بعد دوبارہ ''الحمرا'' جاری کرنے کا خیال کیسے آیا؟

شاہد علی خاں: میری خواہش تھی کہ اپنے والد مرحوم کی ادبی میراث کو زندہ رکھا جائے اور ان کی یادگار قائم ہو۔ اسی جذبے کے تحت 2001ء میں "الحمرا" کو دوبارہ جاری کیا تاکہ معیاری اور صحت مند ادب کی روایت برقرار رہے۔

ارژنگ: آپ کے نزدیک ''الحمرا'' کی بنیادی ادارتی پالیسی کیا ہے؟

شاہد علی خاں: ہماری کوشش رہی ہے کہ رسالہ باقاعدگی سے شائع ہو، مصنفین کو موضوع کے انتخاب کی آزادی دی جائے مگر زبان و بیان کی شائستگی برقرار رہے، غیر ضروری مذہبی تنازعات سے اجتناب کیا جائے، پاکستانیت کو فروغ دیا جائے اور علامہ اقبال و قائداعظم کے افکار کو عام کیا جائے۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

CamScanner

اردو زبان میں لاطینی امریکہ کے متعلق پہلا مکمل سفرنامہ

لاطینو

منفرد سفرنامہ نگار، معروف شاعر، مترجم، مدیر و کالم نگار **عامر بن علی** کے تازہ کار قلم سے

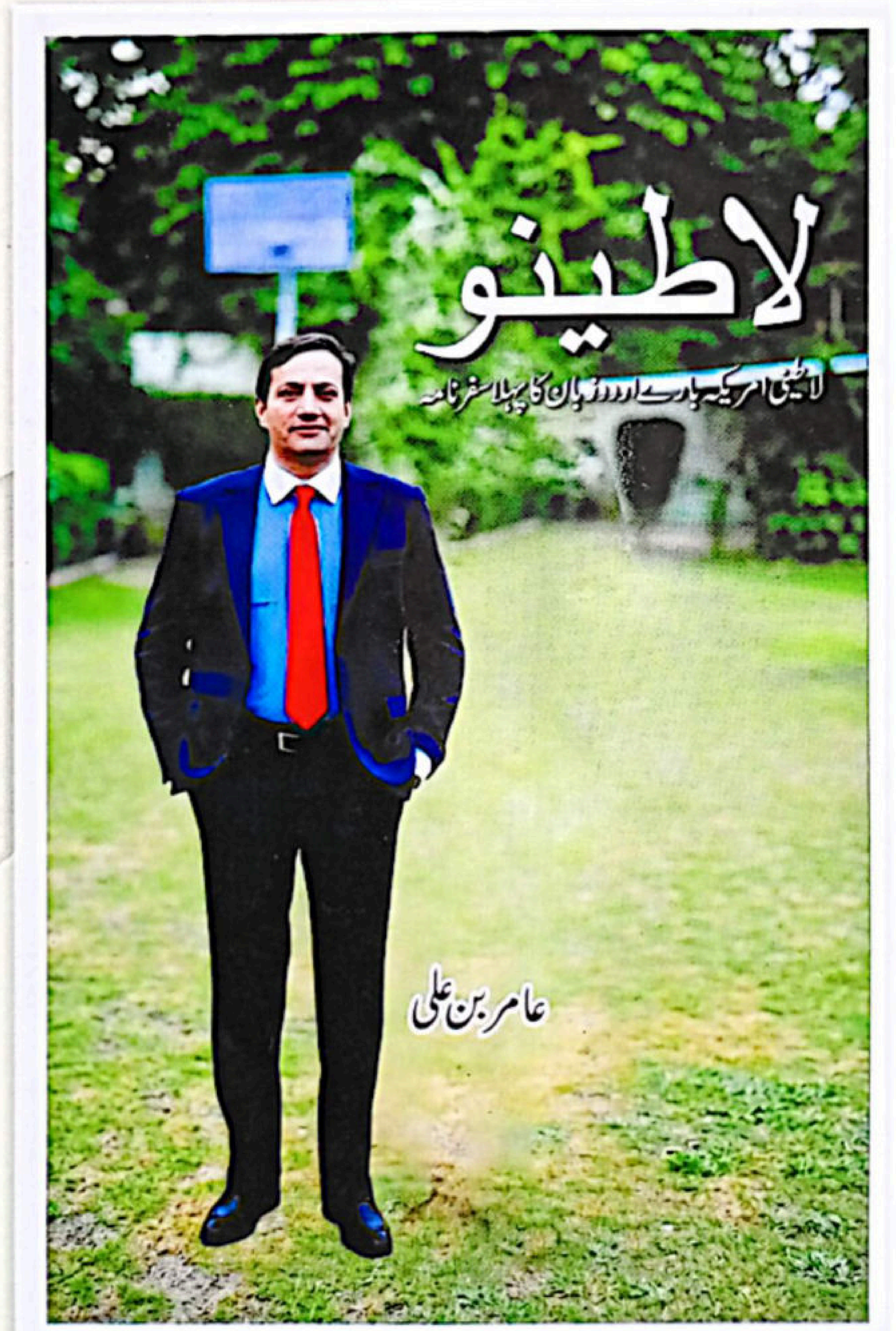

BUY NOW

www.sangemeel.com

اپنے قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

آن لائن خریداری پر ہوم ڈلیوری کی سہولت

قیمت 2000 روپے

براہِ راست خریداری کے لیے ہمارے ادارے پر تشریف لائیں

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

25 لوئر مال، بالمقابل ناصر باغ نزد جی سی یونیورسٹی لاہور

Phone: +92 423 722 0100 / +92 423 722 8143 Fax: +92 423 724 5101